JUNE 2004
کرن
اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب
مفت
پھلوں اور سبزیوں سے علاج

Digest Novels Lovers Group ❤❤

نادیہ امین

یہ عہد کہ دل کو خبر نہ تھی

"انسان جو چاہتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو نہیں چاہتا وہ ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ وہ نہیں ہوا جو میں چاہتا تھا۔ میری زندگی مجھے گزارتی رہی ہے میں نے زندگی نہیں گزاری۔ وقت نے مجھے اپنی مٹھی میں لیا ہے میں نے وقت کو مٹھی میں نہیں کیا۔ لیکن اب یقیناً" کچھ دنوں بعد ایسا نہ ہو۔ کیونکہ میں کچھ ایسا ہی کرنے جا رہا ہوں۔"

گرم شال اس کے کندھوں پر تھی آتش دان کے اندر بھڑکتی آگ کی حدت سے اس کا وجود کافی حد تک سردی کی شدت سے بچ پایا تھا۔ لیکن پھر بھی سردی کی شدت مکمل طور پر ختم نہ ہو سکی تھی۔ لکھتے لکھتے جب وہ کافی تھک گیا۔ تو اس نے ڈائری پر سے اپنی نظریں ہٹا

مکمل ناول

لیں ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھنے کے بعد کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

"چائے پئیں گے آپ۔" اس آواز نے اسے سوچوں سے نکالا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر جب آئی تو اس کے ہاتھ میں دو کپ تھے۔

"یہ لیجیے آپ کی چائے۔" وہ آگ کے قریب بیٹھ کر ہاتھ گرم کرنے لگی تھی۔ آگ کی تپش سے اس کے چہرے کی رنگت مزید تمتما گئی تھی۔ چائے کے کپ سے گھونٹ لے کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے تو وہ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی آخر کار اسے رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھی۔

"کوئی خاص بات ہے۔" لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

"تم خوش تو ہو نا یہاں۔"

"کیا اس بات کے لیے آپ نے مجھے چائے کی دعوت دی ہے۔" اس کی آنکھوں میں حیرانگی تھی۔

"نہیں یہ بات تو میں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔" کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولا۔

"کبھی کبھار مجھے یہ وہم ستاتا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ تم میری وجہ سے سب سے کٹ کر اتنی دور رہنے پر مجبور ہو حالانکہ میں نے ایسا نہیں چاہا تھا لیکن۔"

"پلیز بند کر دیں اس ٹاپک کو۔ اگر آئندہ آپ نے ایسی کوئی بات کی تو میں آپ سے بات کرنا چھوڑ دوں گی پھر آپ چاہیں تو دیواروں کے ساتھ بولیں یا آتش دان کے ساتھ مجھے کوئی پرواہ نہ ہو گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ یہ بات حقیقتاً اسے بہت ہرٹ کرتی تھی۔

"تم تو خفا ہو گئی ہو۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا ہرگز نہ تھا۔" وہ بول رہا تھا۔ لیکن وہ اس کی بات سننے کو رکی نہیں بلکہ تیزی سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی تقلید میں بیڈ روم کی جانب لپکا تھا۔ لیکن وہ دروازہ بند کر چکی تھی وہ اسے پکارتے ہوئے اپنا سر کھجاتا رہ گیا تھا۔

digest-library.com

انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ آگے جا کر اسے اس قسم کے حالات پیش آئیں گے جو اسے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ دیں گے۔ سمجھ یہ نہیں آتی کہ انسان آخر کس چیز کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ حالات کے، زندگی کے، یا تقدیر کے۔

زندگی اتنی بے رحم کیوں ہو جاتی ہے کہ انسان کو تھوڑی سی رعایت بھی نہیں دیتی۔ انسان کو تڑپاتی ہے لالچ دیتی ہے۔ جینے اور زندہ رہنے کی خواہش دل میں جگا دیتی ہے اگر زندگی ایسا نہ کرتی تو آج کوئی زندہ نہ ہوتا۔

ہاں وہ بھی اوروں کی طرح زندگی کا مارا ہوا تھا۔ ماں باپ نے وفات پائی اظہر انکل کا ساتھ چھوٹا۔ اور وہ۔۔۔ ایک بار پھر زندگی اسے اپنے سامنے اپنے مقابل کھڑا کر چکی تھی۔ دربدر کی ٹھوکریں اس کی قسمت میں لکھی جا چکی تھیں۔ بھوک کیا ہوتی ہے یہ اب پتہ چلا تھا محنت سے ہاتھ اس قدر کھردرے ہو جاتے ہیں۔ اب دیکھیے مالک کی جھڑکیاں روح کی غذا بن گئیں۔ اس دکان میں کام کرتے ہوئے اسے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ گاڑیوں کو دھونا اس کا کام تھا مالک کا رویہ اس کے ساتھ کچھ اچھا نہ تھا۔ بلکہ وہ تھا ہی بے رحم انسان، ذرا سی غلطی پر کوئی اس قدر مار سکتا ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور آج۔۔۔ آج تو مالک نے انتہا ہی کر دی اسے نکال دیا اسے رونا آتا تھا اپنی تقدیر پر، ہر غریب، لاچار، بے کس روتا ہے اپنی تقدیر پر۔ وہ بھی بیٹھا رو رہا تھا۔ آس پاس گزرتے لوگوں کو شاید وہ کسی جن کی طرح نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ یا شاید بے حسی نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

"کون ہے تو۔ یہاں بیٹھا رو کیوں رہا ہے۔" ان میں سے ایک کو شاید وقت گزارنا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ ایک گھٹے ہوئے قد اور قدرے موٹے جسم کا گنجا آدمی اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔" اس نے سسکتے ہوئے کہا

تھا۔

"بھوک لگی ہے تجھے۔ تو کیا رونے سے تجھے کچھ مل جائے گا۔ گھر نہیں ہے تیرا۔" شاید اسے اس پر ترس آیا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"اچھا یوں کر تو یہاں میرے ساتھ اس ہوٹل میں کام کر میں تجھے دو وقت کی روٹی دوں گا اور پانچ روپے روز کے۔ اس سے زیادہ نہیں۔" شاید اسے بھی نوکر کی بہت ضرورت تھی وہ فوراً راضی ہوا تھا۔

"چل آمیں تجھے کچھ کھلاؤں۔"

وہ سستے درجے کا ہوٹل تھا کچھ کرسیاں اور چیزیں باہر پڑی تھیں۔ اسے غریبوں کا ہوٹل ہی کہا جا سکتا تھا۔ رات کے اندھیرے نے جب اس علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیا تو وہ شخص ساری چیزیں اندر رکھ کر ہوٹل بند کرنے لگا تھا۔ وہ جانے سے پہلے تمام چیزوں کا اچھی طرح سے جائزہ لے رہا تھا۔ کہ ایک دم اس کی نظریں اس لڑکے پر پڑی تھیں۔ وہ سمٹا سمٹایا وہیں بیٹھا ہوا تھا۔

"ارے تو ابھی تک یہاں ہے۔" وہ حیرت سے بولا تھا۔

"تو رات کہاں گزارے گا؟" اس نے اگلا سوال داغا تھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ سسکیاں لینے لگا تھا۔

"اچھا یوں کر۔۔۔" وہ کچھ سوچ کر بولا تھا۔ "آ میرے ساتھ۔" پھر وہ اسے اپنے گھر لے گیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی بیوی اس کے ساتھ لڑکے کو دیکھ کر خفا ہوئی تھی۔

"کون ہے یہ؟"

"بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تو اس کے سونے کا بندوبست کر۔" اس کی بیوی کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ پھر اس نے ناگواری سے اس کے لیے باہر ہی چارپائی ڈال دی تھی۔ تکیہ رکھ کر اسے اشارے سے بلایا تھا وہ تو جیسے منتظر ہی بیٹھا تھا۔ اس کے اشارے پر فوراً چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔

"سنو آج کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن میں اسے کل سے نہ دیکھوں۔" اس نے عورت کی آواز سنی تھی۔

"بے چارہ اکیلا تھا مجھے۔۔۔۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔ اسے یہاں سے روانہ کر دو ورنہ میں باپ کے گھر چلی جاؤں گی۔"

"اچھا اچھا۔ کل نہیں آئے گا یہ۔" اس نے ناگواری سے جواب دے کر اسے مطمئن کر دیا تھا۔

دوسری رات وہ اس سے نظریں چراتا ہوا اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ کہاں جائے۔ پھر وہ نڈھال قدموں سے قریبی پارک میں گیا تھا۔ جہاں اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے۔

"مکسینہ سے بات کی تھی تم نے۔" ان چاروں میں سے ایک بولا تھا۔ پارک کے ایک گوشے میں کھڑے وہ شاید کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک بار بار اپنی گھڑی پر نظر ڈال رہا تھا' اس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل بھی تھا جس پر وہ کسی کا نمبر ڈائل کرنے لگا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی مودب کھڑے تھے جبکہ وہ ٹہل ٹہل کر موبائل پر کسی سے بات کرنے لگا تھا۔

وہ اپنا سر گھٹنوں میں دیے ہنوز بینچ پر بیٹھا تھا۔ مختلف سوچوں نے اس کا گھیراؤ کیا تو بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ اس کی ہچکیوں کی آواز رات کے سناٹے میں عجیب سوز پیدا کر رہی

"عمران ڈائجسٹ کا ایک حیرت انگیز سلسلہ"

ایڈونٹس

اب دو حصوں میں شائع ہو گئی ہے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۱۴۳ اردو بازار کراچی

تھی۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر تک روتا رہا تھا۔ پھر اسے قریب ہی قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ پھر اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا تھا۔ اس کے گرد چار آدمی کھڑے تھے ایک کے ہاتھ میں موبائل بھی تھا۔

"کون ہو تم؟" موبائل والے نے سوال کیا تھا۔

اس کی ہچکیاں مزید بلند ہو گئیں۔

"گھر نہیں ہے تمہارا؟" وہی آدمی پھر سے پوچھنے لگا تھا۔ جبکہ باقی تینوں بے زار سی شکلیں بنائے ہوئے تھے۔

"نہیں۔"

"کیا تمہارا کوئی رشتہ دار بھی نہیں ہے؟" وہ ایک دفعہ پھر نفی میں سر ہلا گیا تھا۔ اپنی شہادت کی انگلیاں اپنے ماتھے پر پھیرتے ہوئے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"چل اٹھ۔" کچھ دیر بعد وہ بولا تھا۔

"تو میرے ساتھ رہے گا۔" وہ اسے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بولا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی تھی۔ وہ الجھ گیا تھا کچھ دیر ہچکچایا۔

"آؤ نا۔" وہ پھر سے بولا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ باقی تینوں کو اپنے مالک کا رویہ سمجھ میں نہ آیا تھا۔

digest library.com

"سکندر! بات سنو۔" یار برا اس کی پشت پر کھڑی اس کو مخاطب کر رہی تھی۔

"او ہو۔ تم کیوں خیریت ہے؟" اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"خیریت ہے بس میرا موڈ آؤٹنگ کا ہو رہا تھا تو۔" وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

"نہیں پھر کبھی سہی اس وقت تو مجھے چھٹی نہیں مل سکتی۔ تمہیں پتہ ہے کہ گپتا صاحب کس قدر سخت ہیں۔" وہ بے چارگی سے وضاحت دینے لگا تھا۔ وہ "نیور مائنڈ" کہتے ہوئے چلی گئی تھی۔ چار بجے وہ کام ختم کر کے روانہ ہوا تھا۔ وہ ایک انڈین ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ گپتا صاحب نے اسے اپنے ہوٹل کا منیجر رکھا تھا۔ گاڑی کو راستے پر ڈالتے ہوئے وہ اپنی دن بھر کی مصروفیت کو سوچتا رہا تھا۔ اس کا فلیٹ دوسری منزل پر ہی تھا۔ آنے جانے میں اسے زیادہ مشکل نہ ہوتی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر چلا آیا تھا۔ زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ سو پہلے کچن کا رخ کیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے اپنے لیے چائے بنائی تھی مگ ہاتھ میں لیے وہ لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ چینل پر چینل بدلتا رہا۔ ساتھ ساتھ رسالے کی ورق گردانی بھی جاری رہی۔ پھر تنگ آکر رسالہ میز پر پٹخ دیا تھا۔ اور وہیں صوفے پر دراز ہو گیا تھا۔ بایاں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ دیا تھا۔ چند لمحوں بعد ٹی وی کی مدھم آواز پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور وہ نیند کی وادیوں میں اتر چکا تھا۔

اس کی عمر بارہ سال تھی۔ وہ اسے ساتھ تو لے آیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھی اس کی اس حرکت سے ناخوش تھے۔ وہ انہیں خوامخواہ کا درد سر لگ رہا تھا۔ اس کی بیوی شروع میں تو کافی کچھ کہتی رہی لیکن لڑکے کی حد درجہ معصومیت پر اس کا دل بھی پسیج گیا تھا۔ کچھ دباؤ شوہر کی طرف سے بھی پڑا تھا۔ وہ لڑکے کو یہ باور کرا چکا تھا کہ وہ اسے اپنا گھر سمجھے ساتھ ہی بیوی کو بھی اس کا خیال رکھنے کا کہا تھا۔ وہ رات کو دیر سے گھر آتا تھا لیکن وہ اس کی خیریت اس کا حال احوال پوچھنا کبھی نہ بھولتا تھا۔

پورا امرتسر اس طرح کے بچوں سے بھرا پڑا تھا۔ یتیم' لاوارث' لیکن پتہ نہیں کیوں رات کے اندھیرے میں اس روتے بلکتے بچے کی سسکیاں اس کے دل کو چیرتی ہوئی اس کے زخموں کو تازہ کر گئی تھیں۔ وہ خود یتیم تھا۔ اس نے بھی حالات کے تھپیڑے کھائے تھے۔ اگرچہ ان نامساعد حالات نے اسے بے حس بنا دیا تھا۔ لیکن اس بچے کو دیکھ کر اس کے دل میں ازلی ہمدردی امڈ کر آئی تھی جو جانے کب سے مفقود ہو چکی تھی۔

موہن راج نے تو اسے اچھا خاصا جھڑکا تھا کہ وہ کیا مصیبت لے کر آیا ہے۔ لیکن اس کے بے حد اصرار پر

وہ مان ہی گیا تھا۔ وہ اس کا خاص آدمی جو تھا۔ ساتھی بھی یہی کہتے تھے کہ منوج بھائی کا تو دماغ خراب ہو چکا ہے۔ جو خوامخواہ کی درد سر مول رہا ہے۔ منوج کو زندگی میں وہ کچھ ملا جو وہ چاہتا تھا۔ لیکن اولاد کی نعمت سے وہ محروم ہی رہا۔ اس لڑکے سے ہمدردی اور محبت اس محرومیت کی ایک وجہ تھی۔ زندگی کی تلخیاں اس نے بھی کبھی کھیں پھر بے حساب دولت کا دور آیا تھا۔ دولت کمانے کے چکر میں وہ کبھی صحیح اور کے چکر میں نہیں پڑا۔ اگرچہ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کر سکتا تھا لیکن اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کی بیوی نے اس وقت اس کا ساتھ دیا تھا جب پوری دنیا نے حقیر سمجھا۔ اب اپنی بیوی کو تکلیف دینے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ اس کی بیوی نے ایک آدھ مرتبہ اسے شادی کرنے کو کہا بھی تھا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ اور پھر ضروری نہیں کہ برے آدمی کے سرے سے کوئی اصول ہی نہ ہوں۔

منوج نے اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اسے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اس کا تعلیمی سلسلہ جو چھٹی جماعت سے چھوٹا تھا دوبارہ شروع ہوا۔ زندگی اپنے ڈھب پر جاری تھی۔ وہ فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا جب وہ واقعہ رونما ہوا تھا، جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس واقعہ نے اس کے اندر بے چینی و اضطراب پیدا کیا تھا۔ وہ بکھر گیا تھا۔ ٹوٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈیٹرائٹ کے موسم کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا جانے کب جل تھل ہو۔ اس موسم میں واک کے لیے نکلنا سراسر حماقت تھی۔ لیکن یہ حماقت سرزد ہو چکی تھی۔ سردی بے تحاشا محسوس ہو رہی تھی۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بارش کے قطروں میں تیزی آنے لگی تو اس نے نزدیکی فلاور شاپ میں پناہ لینے کا سوچا تھا۔ شاپ میں گھستے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئی تھیں۔ بلاشبہ وہ وہی تھی۔ مکمل ایک حجاب میں پورے جسم کو ڈھانپے ہوئے سوائے چہرے اور ہاتھوں کے، یہاں اس کی موجودگی پر وہ حیران و پریشان ہو گیا تھا۔

''جی کہیے۔'' وہ اس سے مخاطب ہونے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر پہچان کا ہلکا سا تاثر بھی نہ تھا۔

''وہ بارش ہو رہی تھی تو اس سے بچنے کے لیے میں یہاں رک گیا تھا۔'' وہ وضاحت دینے لگا تھا۔ اس نے سر ہلا کر اسے رکنے کی اجازت دی تھی پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ نظریں نیچی کیے کھڑا رہا تھا۔ پھر تنگ آ کر اس نے باہر سڑک پر نظریں دوڑائی شروع کی تھیں۔ ڈاکٹر واحد کے گھر اس سے ایک دو دفعہ سرسری ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ وہاں کسی کام کے سلسلے میں ہی آئی تھی۔ بقول ڈاکٹر واحد کے اس کے بارے میں وہ کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ البتہ ان کے نانا کا وہ کچھ عرصے سے علاج کر رہے ہیں' اس کا سراپا اس کے ذہن میں محفوظ اس لیے بھی تھا کہ ڈاکٹر واحد کے گھر اسے مکمل حجاب میں دیکھا تھا وہ اس کے پردے پر ششدر رہ گیا تھا کہ امریکہ جیسے ملک میں بھی کوئی یوں پردہ کر سکتا ہے۔ لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اسے ہرگز پہچان نہ پائی تھی شاید اسے یہ تک یاد نہ ہو کہ وہ اس سے ملی بھی تھی کہ نہیں۔ جوں ہی بارش کی شدت میں کمی آئی تو وہ اس کی شاپ سے نکل آیا تھا۔ لیکن شاپ پر شاید اس کا کچھ رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

''آؤ باہر چلتے ہیں۔ ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی۔'' وہ جو کپڑے استری کرنے کا سوچ رہی تھی اس کی آفر پر اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی تھی۔

''میں چادر لے لوں۔'' اسے بتا کر وہ چادر لینے اندر گئی تھی۔ چادر اچھی طرح لپیٹے وہ آ چکی تھی۔ پیدل چلتے ہوئے وہ سڑک پر نکل آئے تھے۔ کالے بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں آسمانی بجلی بھی گرج چمک رہی تھی۔ کہتے ہیں جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ یہاں بھی یہی حالت تھی۔ موسم کافی خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا عجیب سا لطف دے رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا بھی اپنا موڈ بدل دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا۔

جیسے زمین پر موجود ہر چیز کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے گی اور کبھی یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ہوا ابھی لوگوں کو خوشی، زندگی اور کامیابی کی نوید سنانے آئی ہو۔

"تمہیں وہ دن یاد ہے جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی؟" چلتے چلتے ایک دم اس نے سوال کیا تھا۔

"ہاں یاد ہے۔" اس کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا تھا۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ تم میری بیوی بنو گی۔ میرے وہم و گماں میں بھی نہ تھا۔ عجیب سی بات ہے نا۔" وہ نظریں نیچی کیے، بہت غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ لیکن بولی کچھ نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بعض اوقات ایک مسکراہٹ وہ سب کچھ بتا دیتی ہے جو شاید ہزار الفاظ بھی نہ بتا سکیں۔

"یہ سرسبز کھیت کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ آؤ نا قریب سے دیکھتے ہیں۔" پگڈنڈی پر سے اترتے ہوئے وہ بولی تھی۔ وہ دونوں کھیتوں میں چلنے لگے تھے۔ کھیتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جہاں گندم کی فصل اپنے جوبن پر تھی۔ "احتیاط سے" وہ بار بار خبردار کر رہا تھا۔ وہ بہت پرجوش ہو رہی تھی۔ گیلی گیلی مٹی سے جوتے کافی حد تک اٹ چکے تھے۔ راستے میں انہیں بہت سی عورتیں ملیں جن کے سروں پر پانی کے بھرے گھڑے تھے۔ کنواں نزدیک ہی ایک کھیت میں تھا جہاں سے عورتیں پانی بھر لاتی تھیں۔

"یہ عورتیں پانی بھرتے ہوئے کتنی اچھی لگ رہی ہیں نا۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر پوچھ رہا تھا۔

"تم تنی بھی اچھی نہیں لگتیں۔" اس نے گھور کر کہا تھا۔

"ایک بات تو طے ہے کہ عورت، بہت ہی نیک ہو اچھی ہو پر شوہر کے منہ سے دوسری عورت کی تعریف سن کر جل کر کباب بن جاتی ہے۔ جلتی ہے، بہت سے نا۔"

"جی نہیں۔" وہ تیز آواز میں اس کی بات کی نفی کرنے لگی تھی۔

"مگر وہ جلتی ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ شوہر کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ کسی اور کی تعریف کرے۔" وہ اس کی بات پر ہنس دیا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

"اگر میں مر گیا نا تو تم دوسری شادی ضرور کرنا۔ میری طرف سے تمہیں کھلی اجازت ہوگی۔" وہ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے اپنی نظریں سڑک پر جمائے کہہ رہا تھا۔ چلتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں۔ وہ رک گیا تھا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا تھا۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ اس تک پہنچ گیا تھا۔

"چلو نا تم تو رک گئی ہو۔"

"میں نے نہیں جانا۔" اس نے جانے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا۔" وہ حیرت سے چیخا تھا۔

"آپ میرا گلا گھونٹ کر میری لاش ادھر کھیتوں میں پھینک دیں۔"

"کیا بدتمیزی ہے یہ؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کر رہا تھا۔

"اور آپ جو بدتمیزی کر رہے تھے وہ کیا تھا۔"

"میں ایک حقیقت بیان کر رہا تھا۔ تمہیں پتا ہے کہ..." اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سمجھانا چاہا تھا۔

"نہیں پتا مجھے۔" اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ اور تیز تیز قدم اٹھانے لگی تھی وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔

"دیکھو میں تمہیں اس حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار کر رہا ہوں کہ میں کسی بھی لمحے۔ اچھا پلیز میں ایک بات کر رہا تھا اور تم نے اسے اتنا سیریس لیا۔" وہ بنا کوئی جواب دیے خاموشی سے چلی جا رہی تھی۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ باقی راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔

digest library.com

✿ ✿ ✿

✿ ✿ ✿

وہ مر رہا تھا۔ اس کی سانس رکنے لگی تھی۔ اس کی

روح آسمان کی وسعتوں میں کھونے لگی تھی۔ اس کے جسم میں جان نہ رہی تھی۔ اس کا جسم خالی ہو گیا تھا۔ پھر جسم میں روح محسوس ہوئی تھی۔ روح کچھ بولی تھی۔ ہاں چیخ رہی تھی۔ پھر اس نے نہایت تیز چیخ ماری تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ گیا تھا۔ بیٹھ کر اس نے اپنے جسم کو، چہرے کو چھوا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ گردن پر پھیرتے ہوئے کچھ محسوس کرنا چاہا تھا۔ اس کی گردن میں درد ہو رہا تھا۔ اس کے حلق میں بھی تکلیف تھی۔ حلق میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ اس کے اندر ذرا سی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ اس کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے اپنے حواس بحال کرنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت نارمل ہو گئی تھی۔ آج دوسری مرتبہ وہ خواب میں ڈر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سب اپنی سیٹوں پر سے اٹھ گئے تھے۔

"اجے! ابھی جانا نہیں مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" اجے جو دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا تھا۔ وجنتی کھڑی تھی۔ اس نے نکلنے کا ارادہ ترک کیا تھا۔ دروازے سے ہٹ کر ایک سائیڈ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ سب کے نکلنے کے بعد وجنتی اس کے قریب آ کر بولی تھی۔

"شکریہ میری بات ماننے کا۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید بولتی۔

"کیا بات ہے؟" کہہ کر اس نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"اجے تم نے اس بات کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" وہ چند ثانیے اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر کہہ اٹھا تھا۔

"دیکھو وجنتی میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔" وہ قدرے تیز آواز میں بولا تھا۔

"لیکن کیوں؟"

"دیکھو وجنتی۔ تم جانتی نہیں کہ ناپسندیدہ زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ تم خود سوچو۔ اگر ایک انسان کے دل میں خوشی، محبت، زندہ دلی، شگفتگی کا دور دور تک نام و نشان نہ ہو تو وہ کیونکر ایک کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔ اور وہ بھی شادی شدہ زندگی میرا دل۔۔۔"

"بیٹھو یہاں۔" وہ کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گیا تھا۔

"میرا دل تو بالکل مردہ ہے۔" چند لمحے بعد وہ پھر سے بولا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے۔ مجھے کوئی لڑکی اپیل نہیں کرتی اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لڑکی خود اچھی نہیں یا وہ خوب صورت نہیں۔ بلکہ یہ میرے اندر کے سناٹے ہیں، جو میرے دل کو مردہ بنائے ہوئے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"اجے تم خوامخواہ بحث کیے جا رہے ہو اگرچہ تمہیں پتہ ہے کہ میں تم سے کوئی گلہ نہیں کروں گی۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ بس تم ایک بار ہاں کرو۔ میں بہت خوش رہوں گی۔ اجے پلیز تم سمجھنے کی کوشش کرو میں تمہارے بغیر۔۔۔" وجنتی اسے منا رہی تھی۔

"ایسے نہیں کہو۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر ٹوکا تھا۔ "کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔ اگر کل کو کوئی مجھے اچھی لگی تو اس کے نہ ملنے سے میں مر نہ جاؤں گا۔ یہ فیکٹ نہیں ہے۔ جب میں ماں باپ کی موت کے بعد زندہ ہوں تو تب بھی زندہ رہوں گا۔"

"دیکھو وجنتی۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر سے بولا تھا۔ "تم ایسے بندے کا انتخاب کرو جو تمہاری قدر کرنا جانتا ہو جو تم سے محبت کرے۔ اور مجھے یقین ہے کہ انیل شرما ایسا ہی ہے۔ وہ تمہیں چاہتا ہے۔ اور کیا چاہتی ہو تم؟" وہ زچ ہو کر کہہ رہا تھا۔

"اجے تم سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو۔" وجنتی کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ "میں انیل شرما کی بات نہیں کر رہی میں صرف تمہیں۔۔۔"

"تو پھر میں تمہیں جواب دے چکا ہوں۔ ڈیئس

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

آل۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں ابھی تم دوبارہ سوچو۔ میں تمہیں سوچنے کا موقع دیتی ہوں۔ میں تمہیں کسی اور کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی یہ میری بھی مجبوری ہے۔" حتمی انداز میں کہتے ہوئے وہ چلی گئی تھی وہ وہیں بیٹھا وجنتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج کل وجنتی نے اسے خاصا ڈسٹرب کیا تھا۔ وہ اس کے ہزار بار سمجھانے کے باوجود بھی ہاں کر نہ دے رہی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو جناب؟" انجلی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"کچھ نہیں تم سناؤ؟"

"میں کیا سناؤں۔ اگر تمہاری اس وجنتی صاحبہ نے دیکھ لیا تو یہی سمجھے گی کہ میں تمہیں اڑانے کے چکر میں ہوں۔" وہ شوخی سے ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"چھوڑو وہ تو ہے ہی پاگل۔" اس نے بے زاری سے کہا تھا۔ پھر وہ اٹھ گیا تھا۔ "ارے تم کہاں جا رہے ہو؟" انجلی تقریباً چلاتے ہوئے بولی تھی۔

"گھر۔" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

"لیکن ابھی تو سارے پیریڈ ہونے ہیں۔" وہ حیرت سے بولی تھی۔

"دل نہیں چاہ رہا اٹینڈ کرنے کو۔" پھر وہ چلا گیا تھا۔ انجلی اسے حیرانی سے جاتا دیکھتی رہی تھی۔

digest library.com

فلیٹ سے نکل کر اس نے ڈور لاک کیا تھا۔ پھر اپنی جیب کو چیک کر کے اپنی تسلی کی تھی۔ نیچے گاڑی کے پاس آکر پہلے اس نے اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر حرارت دی تھی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ شیشے چڑھا کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ جوں جوں گاڑی کی اسپیڈ بڑھتی جا رہی تھی اس کے دل کی دھڑکن کی رفتار بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس یخ بستہ شام میں اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی آستین سے اپنے ماتھے کو رگڑا تھا۔ اس کی دھڑکنیں اعتدال کا نام تک بھول چکی تھیں۔ شاپ کے سامنے گاڑی روک کر وہ نکل آیا تھا۔ گلاسز آنکھوں پر چڑھائے وہ اندرونی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ لیکن پھر اس خوف پر لاحول پڑھتے ہوئے وہ آگے بڑھا تھا۔ شاپ میں کھڑی لڑکی پر نظر پڑتے ہی اس کا کوفت کے مارے برا حال ہوا تھا۔

"جی کہئے کیا چاہیے آپ کو؟ میرا مطلب ہے۔"

"جی ایک بکے چاہیے تھا۔" اس کی نگاہیں شاپ کے اندر کسی کو ڈھونڈ کر رہ گئی تھیں۔

"آپ کو ابھی مل جاتا ہے۔" وہ پیشہ ورانہ انداز میں مسکرا کر بولی تھی۔ شکل سے وہ اسے ایشیائی ہی لگی تھی۔ شاید وہ بھی اسے ایشیائی سمجھی تھی تبھی اردو میں بات کر رہی تھی۔ بکے پکڑا کر پیسے وصول کر کے وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ بکے ہاتھ میں پکڑے پہلے تو وہ جانے کا سوچتا رہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے مڑا تھا۔

"سنیے۔"

"جی۔" وہ متوجہ ہوئی تھی۔

"یہاں ایک دوسری لڑکی کام کرتی ہے کیا آج وہ نہیں آئی؟"

وہ لڑکی پہلے تو اس کے سوال پر ہنس دی تھی پھر اپنی مسکراہٹ چھپا کر اتنا کہا تھا۔

"وہ بیمار ہے میں اس کی جگہ کام کر رہی ہوں۔ یہ شاپ اسی کی ہے میں جاب کر رہی ہوں فی الحال یہاں۔"

"او تھینک یو میں نے آپ کو زحمت دی۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ خوش اخلاقی سے مسکرائی تھی۔ پھر وہ اس کی شاپ سے نکل آیا تھا۔ وہ لڑکی غور سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"زندگی میں کتنا سکون کتنا ٹھہراؤ ہے۔ اے کاش کہ ایسا پہلے بھی ہوتا۔"

"مایوسی کی باتیں کرنا گناہ ہے۔" اگلے پل وہ خود کو سرزنش کر رہا تھا۔

بچوں کی چیخ و پکار شور شرابہ جاری تھا۔ کچھ سولہ سترہ سال کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی اونچے اونچے قہقہے لگاتے دور کھیلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بڑے واک کرنے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے میں بھی مصروف تھے۔ وہ پارک میں بیٹھا انجوائے کر رہا تھا۔

"خوب صورت موسم خوب صورت تحفہ ہے کتنی اچھی صاف ہوا چل رہی ہے۔" اس نے مسکرا کر سانس کھینچتے ہوئے ہوا کو اپنے اندر اتارا تھا۔ "یوں لگتا ہے کہ یہ ٹھنڈی تازہ ہوا انسان کے اندر داخل ہو کر اس کے غموں کا مداوا کر رہی ہو۔"

وہ خود کو پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ بینچ پر بیٹھا وہ گاہے بگاہے اِدھر اُدھر اپنی نظریں دوڑا رہا تھا۔ اسے دور زمین پر بیٹھے کچھ بچے اور بوڑھا آدمی دکھائی دیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اس کی عمر بھی کوئی پینسٹھ برس کی تھی پہلے تو وہ اسے انگریز سمجھتا رہا تھا پھر دماغ نے اس کی نفی کی تھی۔ ہونے نہ ہونے کی کیفیت میں وہ اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا تھا۔ وہ بچوں کو کہانیاں سنانے میں منہمک تھا بچے بڑے انہماک سے اس کی کہانی سن رہے تھے۔ وہ بڑے آرام سے ان کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ بچوں کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں جبکہ اس کی نظریں بوڑھے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ بوڑھے نے اسے بیٹھتے ہوئے اور اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لیکن بدستور کہانی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کی انگریزی بڑی رواں تھی۔ وہ اس کی آواز کے سحر میں کھو سا گیا تھا۔ جب دفعتاً اسے خاموشی کا احساس ہوا تھا۔ پھر وہ ہڑبڑا گیا تھا۔ بوڑھا بڑے غور سے اسے تکے جا رہا تھا۔ اس نے اردگرد نظریں دوڑائی تھیں بچوں میں سے کوئی نہ تھا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"شاید اس نے کچھ پوچھا ہے۔" وہ خود سے بولا تھا۔

"انڈیا کا۔" اس نے جواب دے ہی دیا تھا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" اب کی بار اس کے لہجہ میں اسے دوستانہ انداز جھلکتا نظر آیا تھا۔

"سکندر۔" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

"اچھا نام ہے بلکہ بہت اچھا۔" اس نے تعریف سر ہلا کر کی تھی۔

"میرا نام حیات خان ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کرایا تھا۔

"آپ بیٹا میں کیا کہوں کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" وہ اس سے پوچھنے لگا تھا وہ پہلے تو حیران ہوا تھا پھر اس کے چہرے پر شرارت کی جھلک دیکھ کر مسکرا لیا تھا۔

"لیکن مجھے واقعی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ بہت زیادہ۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی زندگی کے ان نو سالوں کو سوچے جا رہا تھا جو اس نے یہاں گزارے تھے۔ وہ انہی خیالوں میں گم تھا۔ جب اسے اپنے کندھے پر کسی کے لمس کا احساس ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ رمیش تھا۔ اس کا ہاتھ اس کے کندھے پر تھا پھر وہ بیٹھ گیا تھا اور اپنا ہاتھ بدستور اس کے کندھوں پر پھیلائے رکھا تھا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیوں اتنے تنہا تنہا سے رہتے ہو۔"

"کچھ نہیں اندر گھٹن سی محسوس ہوئی تو باہر چلا آیا۔"

"سب چلے گئے کیا؟" اس نے سوال کیا تھا۔

"نہیں کھیل رہے ہیں۔ میں تمہاری وجہ سے وہاں سے اٹھا ہوں۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

آج وہ سب دوست رمیش کے گھر میں جمع تھے۔ اندر تاش کی بازی لگی ہوئی تھی۔ امتحانات کے خاتمے پر خوشیاں منائی جارہی تھیں۔

"مجھ سے۔" اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی تھی۔

"ہاں تم سے۔" پھر مزید بولا تھا۔

"دیکھو تم مجھے صحیح اور واضح جواب دو گے۔"

"بات ہے کیا آخر؟" وہ پریشانی سے بولا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے نا کہ۔۔۔" اس نے بات شروع کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میرا مطلب ہے کہ وجنتی تم سے۔۔۔"

"ہاں آگے بولو۔" وہ سنجیدگی سے اور قدرے تلخ لہجہ میں بولا تھا۔

"آگے یہ کہ تم اس سے شادی کیوں نہیں کرتے۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔"

"اچھی لڑکی کا یہ مطلب ہے کہ میں ہر اچھی لڑکی سے شادی کرتا پھروں۔"

"میں ہر لڑکی کے بارے میں نہیں کہہ رہا۔"

"تم اس کے وکیل بن کر آئے ہو۔ اسی نے تمہیں بھیجا ہے نا۔" وہ سپاٹ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"تم کچھ بھی سمجھو۔ لیکن میں تمہیں یہ ضرور کہوں گا کہ تم بعد میں پچھتاؤ گے۔"

"پلیز رمیش۔ میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں سنوں گا۔ میں وجنتی سے کہہ چکا ہوں۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولا تھا۔

"دیکھو وہ تم سے مخلص ہے۔ وہ ایک اچھی شریک حیات ثابت ہوگی۔" وہ ہار نہیں ماننا چاہتا تھا۔ تبھی بولا تھا۔ "کیا تم کسی اور کو پسند کرتے ہو؟"

"نہیں۔" وہ سختی سے بولا تھا۔ "کسی کے ساتھ شادی نہ کرنے کا مطلب یہ ہر گز نہیں ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ شاید میں نہ بھی کروں۔ جب مجھے خود نہیں پتہ کہ میرا مستقبل کیا ہوگا۔ تو میں تم لوگوں کو کیا بتاؤں۔" چند لمحے بعد وہ دوبارہ بولا تھا۔ "نیل شرما اچھا ہے تم اسے راضی کرو کہ وہ اپنا مستقبل تباہ نہ کرے۔ اسی سے شادی کرلے۔"

"دیکھو ایک بار تم پھر سوچ۔۔۔"

اجے نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تھا اور زور سے اس کا ہاتھ اپنے کندھوں پر سے جھٹکتا ہوا اٹھا تھا۔ تیز تیز قدموں سے وہ گیٹ پار کر گیا تھا۔ پھر کئی دنوں تک دونوں کے درمیان بات چیت بند رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد بات چیت کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا تھا۔

digest.library.com

☼ ☼ ☼

"پتہ نہیں کہاں رہ گئے آخر وہ۔ کتنی دیر ہو گئی ہے۔ انہیں گئے ہوئے۔" وہ خود سے بول رہی تھی۔ وہ شام کا نکلا تھا ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بے چینی سے کبھی اندر کا کبھی باہر کا چکر لگا رہی تھی۔

"کہاں رہ گئے آخر؟ اے پروردگار انہیں صحیح سلامت رکھنا۔" وہ رو رو کر دعائیں مانگ رہی تھی۔

"میں کیا کروں کچھ سمجھ بھی نہیں آرہی۔" وہ چکراتی پھر رہی تھی۔ کھانا کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ عجیب سی وحشت سوار تھی اس پر۔ اتنی دیر تک تو وہ کبھی باہر نہ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر وہ لیٹ گئی تھی۔ نیند آنکھوں سے دور تھی ایک عجیب سی تھکن اس کے وجود پر سوار تھی۔ ٹائم دیکھا تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ یکدم وہ اٹھی۔ اسے گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی۔ جب کمرے سے نکلی تو سامنے ہی وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر جہاں خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے اور اطمینان کی لہر دل میں اتری تھی وہاں اسے اس پر بے تحاشا غصہ بھی آیا تھا۔ ٹی وی کا والیم آہستہ ہی تھا ورنہ تو آواز ہی سے وہ جان جاتی کہ وہ گھر آچکا ہے۔ وہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"اوہ تم ابھی تک سوئی نہیں؟" اسے جاگتا دیکھ کر وہ پوچھنے لگا تھا۔

"کس وقت آئے آپ؟" وہ اس کی بات کا جواب دیے بنا سوال کر گئی تھی۔ اس کا یہ پوچھنا حماقت تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اسے آئے زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔

"کچھ ہی ٹائم ہوا ہے۔ کیوں؟" وہ بڑے آرام سے پوچھ رہا تھا۔

"کیوں! اتنے آرام سے کہہ رہے ہیں آپ کیوں۔ آپ کو پتہ ہے کہ......" اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ پھر وہ خوب دل کھول کر روئی تھی۔ اس کے رونے سے وہ گھبرا گیا تھا۔ "دیکھو پلیز چپ کرو۔"

اس کا ہاتھ پکڑ کر کچھ بولنا چاہتا تھا جب وہ چیخی تھی۔ "ڈونٹ ٹچ می۔"

"اوکے۔" وہ اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھائے بولا تھا۔

"مجھے شہباز خان نے روک لیا تھا۔ وہ بہت اصرار کر رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ کھانا کھاؤں اس وجہ سے ذرا دیر ہو گئی۔" اس کی وضاحت تفصیلی تھی۔

"ذرا دیر ہو گئی۔" وہ تلخی سے بولی تھی۔

"نہیں۔" اس نے سر ہلا کر کہا تھا۔

"میں یہاں جیوں مروں آپ کو کیا۔" وہ چیخ پڑی تھی۔ "آپ کو پتہ ہے کہ مجھے اپنی پرواہ نہیں مجھے پرواہ ہے تو آپ کی اگر آپ اپنی پرواہ نہیں کریں گے تو اس کے لیے میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تو پہلے آپ مجھے مار دیں پھر آپ جہاں چاہیں عیش کریں۔"

اس کی زبان زہر اگل رہی تھی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ وہ سر جھکائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ شرمندگی ہی اتنی محسوس کر رہا تھا۔

"پلیز مجھے معاف کر دو آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ پلیز میں کہہ رہا ہوں نا۔" پھر وہ اٹھ گیا تھا۔ ایک گلاس میں پانی لا کر اسے پلانے لگا تھا۔

"اگر ایسا ہوا تو۔" اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"نہیں ہو گا نا۔ وعدہ تو کر رہا ہوں۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھیے دنیا میں کتنی خوب صورت جگہیں ہیں۔ لیکن ہم لوگ ان سے کس قدر بے خبر ہیں' ہے نا۔" وہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھی اس سے پوچھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے پتھر تھے جنہیں پانی میں پھینکتی جا رہی تھی۔

آج شام وہ اسے یہاں لے آیا تھا۔ یہ جگہ آبادی سے نسبتاً دور تھی دو پہاڑوں کے درمیان ایک بہت بڑی ندی تیزی سے بہہ رہی تھی پانی کا شور علاقے کی خاموشی پر حاوی تھا۔ بہتی ندیا کے ساتھ ایک بہت بڑی سڑک بنائی گئی تھی پہاڑ کی چوٹی سے سڑک ایک پٹی کی مانند دکھائی دیتی تھی۔ سرسبز پہاڑوں کے عکس پانی میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں دنیا مافیہا سے بے خبر آپس میں باتیں کیے جا رہے تھے۔ باتوں میں وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا تھا۔ اسی دوران دور سے ایک جیپ آتی دکھائی دی تھی۔

"وہ دیکھو۔ جیپ آ رہی ہے۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"شہباز خان کی ہے۔" وہ اٹھ کر سڑک پر آ گیا تھا۔ قریب آ کر جیپ رک گئی تھی۔ اس میں سے ایک سرخ و سفید لمبا تڑنگا شخص نکل آیا تھا۔ جیپ میں تین بندے اور بھی تھے لیکن وہ جیپ میں بیٹھے رہے تھے۔

"کیسے ہو اسفند خاناں؟" شہباز نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا تھا۔

"بالکل ٹھیک تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟"

"اسفند خاناں۔" جوش میں وہ یہی نام لیتا تھا۔ "ہم تو ٹھیک ہیں۔ آپ بتاؤ کیا سیر شیر کرنے آئے ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔" وہ ہنس رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کرو سیر شیر مزے کرو۔" وہ خوش دلی سے بولا تھا۔ پھر ہاتھ ملا کر گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوا تھا۔ وہ اپنا چہرہ موڑے اس کی باتیں سن رہی

تھی۔ جیپ کے اسٹارٹ ہونے اور دور ہوتی آواز پر اس نے اپنا رخ پھیر لیا تھا۔ اسفند اس کے قریب آ کر اس کے نزدیک بیٹھ گیا تھا۔

"یہ شہباز خان تھا۔" وہ بولی تھی۔

"ہوں۔" اس نے ہولے سے سرہلایا تھا۔

"کبھی کبھی تمہارے دل میں یہ خواہش نہیں مچلتی کہ ہم اپنے گھر جائیں۔ ان چٹانوں اور پہاڑوں سے نکل کر اپنوں سے ملیں۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کر رہا تھا۔

"ہرگز نہیں۔" پھر اس پر قنوطیت کا دورہ پڑ گیا۔

"کیوں؟" وہ اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوا تھا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں اس بہتے پانی میں چھلانگ لگاؤں۔" وہ زچ ہو کر بولی تھی اور پھر اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

"ارے تم تو سیدھے سیدھے دھمکیوں پر اتر آتی ہو میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔" وہ اسے مزید غصہ دلا رہا تھا۔

"آؤ چلیں۔" وہ اسے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا تھا۔

"یہاں اتنے خطرناک لوگ آتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو ان سے ڈر نہیں لگتا۔"

"نہیں۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پر آ گیا تھا۔ "یہ لوگ عادی ہو گئے ہیں یہ بڑے سخت اور نڈر ہیں۔ ان چیزوں کے عادی ہیں یہ اگر کوئی قتل کرتا ہے تو یہاں چلا آتا ہے۔ اگر ڈاکو وغیرہ ہوں تو وہ بھی یہیں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔" وہ اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ سرہلاتے ہوئے بہت غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ پھر باتوں باتوں میں وہ دونوں گھر چلے آئے تھے۔

✡ ✡ ✡

پھر اس کے بعد اس کی ملاقات انکل حیات سے پارک میں کئی مرتبہ ہوئی تھی۔ لاشعوری طور پر یا پھر شعوری طور پر وہ وقت نکال کر پارک میں ان کے آنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ آج تو اس نے انکل حیات کو ڈراپ کرنے کی آفر دے ڈالی تھی۔ جو انہوں نے بخوشی قبول کر لی تھی۔ راستے بھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ انکل حیات اسے ایڈریس بتاتے رہے۔ ان کے گھر کے قریب اس نے گاڑی روک دی تھی۔

"آؤ بیٹا تمہیں چائے وائے پلاؤں۔" اترنے سے پہلے انہوں نے اسے چائے کی آفر دی تھی۔

"نہیں انکل پھر کبھی سہی ابھی دیر ہو رہی ہے۔"

"اچھا پھر کبھی سہی۔" انہوں نے اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے خوش دلی سے کہا تھا۔

انکل حیات نے ڈور بیل کا بٹن دبا دیا تھا۔ وہ گاڑی ریورس کرنے لگا تھا جب ان کے گھر کا دروازہ کھل گیا تھا۔ دروازے سے نکلنے والی اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔ جبکہ وہ اسے دیکھ چکا تھا۔

وہ یہ جان گیا تھا کہ حیات خان ہی اس کے نانا ہیں جن کا علاج آج کل ڈاکٹر واحد کر رہے ہیں۔ انکل حیات کی زبانی اسے یہ پتہ چلا تھا کہ ان کی جوانی اور بڑھاپا امریکہ میں گزرا تھا۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی جس کی شادی انہوں نے اپنے بھتیجے سے کرا دی تھی۔ الیاس آفریدی اور لالا برگ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گئے تھے۔ تب سے جمان اپنے نانا کے پاس رہنے لگی تھی۔ حیات خان نے اپنی ساری زندگی کا جمع جتھا یہیں لگا دیا تھا۔ یہیں انہوں نے ایک گھر بنایا تھا۔ ایک شاپ کھولی تھی۔ ان دنوں چونکہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ اس لیے ان کی شاپ ان کی نواسی چلا رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

digest library.com

آج تو خوب رونق جمی تھی۔

"انکل آپ چیٹنگ کر رہے ہیں۔ ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" وہ چلا اٹھا تھا۔ وہ دونوں قالین پر رکھے کشنز پر براجمان شطرنج بچھائے گیم میں مصروف تھے۔ ساتھ ہی چلا بھی رہے تھے۔ کسی کے

اندر آنے پر دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ سامنے وہ کھڑی تھی۔

اس کی آنکھوں میں تھوڑی سی حیرت امڈ آئی تھی۔ لیکن اگلے ہی پل اس کے چہرے پر بےزاری کے آثار دکھائی دیے تھے۔ سکندر یک لخت اٹھا تھا اور صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اپنی حرکت اسے خود سمجھ میں نہ آئی تھی۔ ہاتھ بے ساختہ پہلے بالوں اور پھر شرٹ تک پہنچا تھا۔ شاید اسے اپنی حالت درست کرنے کا خیال آیا تھا۔

"اوہ تم آگئیں۔ آج تم جلدی نہیں آئیں؟" انکل نے خوشگوار موڈ میں سوالات کی بوچھاڑ کی تھی۔

"طبیعت خراب تھی میری' تو بس بند کر دی شاپ۔ نانو آپ کھانا کھا چکے ہیں یا ابھی تک صرف ٹھیل سے ہی گزارہ ہو رہا ہے۔" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہوا تھا۔ اسے سامنے بیٹھے بندے پر تاؤ آ رہا تھا جسے کچھ دنوں سے وہ اپنی فلاورز شاپ کے اردگرد منڈلاتے دیکھ رہی تھی۔

"لڑکی غصے میں ہے۔" سکندر نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

"ہاں کھا چکا ہوں۔"

"اور دوائی آپ نے۔" وہ جرح کے موڈ میں تھی۔

"ہاں پی لی ہے۔" لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے انکل کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ پھر وہ کچھ لمحے وہاں کھڑی رہی۔

"نانا جان وہ۔" وہ کچھ کہنے لگی تھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نگاہ سکندر پر پڑی۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا

"ہاں کہو کیا بات ہے؟" وہ اس کی طرف متوجہ تھا۔

"کچھ نہیں پھر کبھی سہی۔" کہتی وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"دیکھا یوں تفتیش کرتی ہے جیسے سی آئی اے میں ہو۔" وہ ہنس دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔" دوسری طرف انجلی تھی۔

"ہیلو اجے! کیسے ہو تم۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں چہکی تھی۔

"میں تو ٹھیک ہوں تم سناؤ۔"

"میں' میں بھی ٹھیک ہوں۔ میں نے سوچا تم تو یاد کرتے نہیں میں ہی تمہیں یاد کرلوں۔" اس نے کہا تو وہ بولا تھا۔

"اچھا کیا جو تم نے فون کیا میرا ارادہ تھا تمہیں فون کرنے کا لیکن ٹائم نہیں ملا۔" وہ وضاحت دینے لگا تھا۔

"تم بہت سنگدل انسان ہو وجنتی صحیح کہتی تھی۔" وہ چہکی تھی۔

"اچھا۔" وہ ہنس دیا تھا۔ "کیا کیا ہے میں نے؟"

"واٹ کیا کیا ہے کیا مطلب۔ تم نے ایک دن بھی ہماری خیر خبر نہیں لی۔ کالج کیا چھوڑا ہم بھی چھوٹ گئے۔"

"چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ کہ آج کل کیا کر رہی ہو؟"

"جھک مار رہی ہوں۔" وہ ہنسی تھی۔ "فی الحال تو کچھ نہیں کر رہی لیکن جاب کا ارادہ ہے میرا۔ تم سناؤ کیا کوئی لڑکی پسند کی؟" وہ شرارت پر آمادہ تھی۔

"ہاں۔" وہ دلکشی سے بولا تھا۔

"کسے؟" قدرے چیخ کر کہا گیا تھا۔

"تمہیں۔" وہ اسے زچ کر رہا تھا۔

"ایسے مت کہو ورنہ تو میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی اور دوسرے ہی دن تم اخبار میں خبر دیکھو گے کہ انجلی کو وجنتی نے رقابت کی آگ میں جلا کر مار ڈالا۔" اس کا اونچا قہقہہ اس کے کان پھاڑنے لگا تھا۔

"بائی دا وے۔ وجنتی کا نہیں پوچھو گے۔" آواز میں کچھ اگلوانے کا اشتیاق تھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھے امید ہے کہ اب وہ ٹھیک بھی ہو گی اور خوش بھی۔" اس کے لہجے کی سنجیدگی نے اسے

موضوع بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات سے بارش وقفے وقفے سے جاری تھی۔ کبھی کھل کر برستی تو کبھی پانی کے قطرے اپنی رفتار کم کر دیتے۔ بارش سے موسم کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگوں کا گھروں سے نکلنا دشوار ہو گیا تھا۔ پہاڑوں پر سفید جمی برف دلفریب نظارے پیش کر رہی تھی۔ وہ موسم کے مطابق گرم گرم پکوڑے تل رہی تھی۔ کہ اس نے پکار لیا۔
بھاگم بھاگ اس کے پاس آئی تھی۔
"کیا ہے؟"
"ڈائری ہے پر پین غائب۔" وہ خفت سے بولا تھا۔
"آپ ہی نے تو رکھا تھا۔ کہاں چلا گیا۔"
"مجھ سے پوچھ کر نہیں گیا۔" وہ بے ساختہ بولا تھا۔
"یہ دیکھیے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ہے۔ آپ خود رکھ دیتے ہیں۔ پھر بھول جاتے ہیں۔ ویسے یہ ڈائری کب ختم ہو گی۔"
"بس جلد ہی۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولا تھا۔
"چلو پھر ہم بھی پڑھ لیں گے۔" اس کا انداز شگفتہ تھا۔
"ہرگز نہیں اس میں روز کی باتیں ہیں۔"
"تو پھر تو میں ابھی پڑھوں گی۔" وہ ڈائری جھپٹنے کے لیے اس کی طرف لپکی تھی۔ ایک ہاتھ سے اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور دوسرے میں ڈائری اٹھا کر اس کی پہنچ سے بچا رہا تھا۔ وہ بار بار جھپٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر کار تھک ہار کر اس نے جھپٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور آسانی سے ہار مان لی تھی۔ یہ کہتے ہوئے کہ۔
"پھر کبھی سہی۔"
"چائے ملے گی؟" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔
"خالی چائے نہیں کھانے کو پکوڑے بھی۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی تھی۔

دوسرے دن موسم کافی اچھا تھا۔ دو دن کی مسلسل بارش کے بعد چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی۔ سورج۔ آخر اپنا دیدار کرا ہی لیا تھا۔ وہ صبح سے صفائی میں مصروف تھی۔ صفائی سے فارغ ہونے کے بعد اس نے پائپ لگایا تھا۔ باہر لان کے ساتھ ملحقہ برآمدے میں پڑے گملے مٹی مٹی ہو چکے تھے۔ ان کو دھونے آ[illegible] تھی۔ یہ چار کنال پر مشتمل ایک وسیع و عریض گھر تھا۔ لان بھی بڑا تھا۔ اس میں کافی درخت اور پودے تھے۔ پہلی بار اس گھر کو دیکھ کر وہ بہت گھبرائی تھی کہ ان بڑے گھر میں وہ دونوں کس طرح رہ پائیں گے۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ یہاں کی عادی ہونے لگی تھی۔ اس کی گھبراہٹ کافی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ یہ گھر دراصل شہباز خان کا تھا۔ وہ آفریدی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ کافی دولت مند اور اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ اس علاقے میں اس کا بڑا نام اور شہرت تھی وہ اسفند کا دوست تھا۔ دن بھر کی صفائی سے اس کی اپنی حالت ب[illegible] عجیب و غریب ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ پائنچے چڑھا[illegible] پودوں کو دھونے میں لگی ہوئی تھی۔
وہ ساری رات کا جاگا ہوا تھا۔

رات کو ڈائری لکھتے لکھتے وہ دیر سے سویا تھا۔ اس دن چڑھے تک سوتا رہا تھا۔ کچن میں جھانکنے کے بعد باہر چلا آیا تھا۔ وہ اسے پودوں میں مصروف ملی
"یہ صبح ہی صبح کیا ہو رہا ہے؟" وہ اس تک پہنچ چکا تھا۔
"صبح ہی صبح نہیں دوپہر کہیے۔"
"کیا کر رہی ہو؟"
"صفائی کی ہے۔" وہ بدستور کام میں مصروف تھی۔
"یہ کیا کر رہی ہو؟" اب اس کا دھیان مکمل اس کے کام کی طرف گیا تھا۔ تبھی حیرت سے بولا
"دیکھ نہیں رہے پودوں کو صاف کر رہی ہوں"
"دو دن کی بارش کیا کم تھی۔ جو تم صاف [illegible] ہو۔" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ڈانٹنے کے انداز میں بولا تھا۔

digest library.com

"سارے پودے مٹی مٹی ہو چکے ہیں تو پانی سے صاف کر رہی تھی۔" دھیمے لہجے میں صفائی دیتے ہوئے بولی تھی۔

"بے وقوف۔ جاؤ کپڑے چینج کرو سردی ہے بیمار پڑ جاؤ گی۔ رکھ دو یہ پائپ۔" وہ اسے اچھا خاصا ڈانٹ رہا تھا۔

"جاؤ پہلے کپڑے چینج کرو پھر چائے بنا کر یہاں لے آؤ۔" وہ لان میں رکھی کرسیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولا تھا۔ اس نے جلدی سے پائپ رکھا تھا اور اندر کی طرف بھاگی تھی۔ وہ اس کی گھبراہٹ پر دل ہی دل میں خوب ہنسا تھا لیکن ہونٹوں پر صرف مسکراہٹ تھی۔

یہاں رہتے ہوئے وہ اس بات کا اندازہ کر چکی تھی کہ یہاں کے لوگ اپنے اصول اور بات میں بڑے سخت ہیں۔

digest library.com

☆☆☆

اشوک مہو کا باپ دبئی کی ایک فرم میں میکینیکل انجینئر تھا۔ وہ ایک قدامت پسند ہندو خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہیں دبئی میں اس نے ایک انڈین عیسائی لڑکی امرتا سے شادی کر لی تھی۔ والدین نے اپنے بیٹے سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ باپ نے بیٹے کو گھر آنے اور اپنی شکل دکھانے سے منع کر دیا تھا۔ جبکہ لڑکی والوں کا رویہ قدرے شدید تھا۔ انہوں نے سرے سے اس شادی کو قبول نہیں کیا تھا۔ لڑکی کے بھائی دونوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ ان دونوں کو دبئی آنا پڑا تھا۔ اشوک مہو نے امرتسر میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اپنے ایک دوست کے توسط سے وہ امرتسر میں کرائے کا گھر لے کر رہنے لگے تھے کچھ عرصے بعد وہ ہوا تھا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن۔۔۔

امرتسر میں واقع اس دو کنال کے بنگلے میں ایک خوبصورت اور خوشگوار صبح کی ابتدا ہو چکی تھی۔

"بیٹا جلدی کرو تمہیں اسکول سے دیر ہو رہی ہے" امرتا اشوک جلدی جلدی کام نمٹانے میں لگی

"ہیلو مما۔" وہ ٹیبل پر آیا تھا۔

"میں تیار ہوں۔"

"ویری گڈ۔" وہ ستائشی لہجے میں مصروف انداز میں بولی تھی۔

"اب آپ کے پپا پتہ نہیں کب تیار ہوں گے۔ ایک تو میں تم دونوں سے عاجز آ چکی ہوں۔ بہت تنگ کرتے ہو تم دونوں مجھے۔ مجھے بھی تو آخر دیر ہو جاتی ہے۔ آفس مجھے بھی جانا ہوتا ہے۔"

"مما۔" وہ ٹیبل پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے بولا تھا۔

"اگر آپ کی تقریر ختم ہو چکی ہو تو مجھے ناشتا کرائیں۔" مما اسے گھور کر رہ گئیں۔ جبکہ وہ ہنس دیا تھا۔

"اوہ تو آج ہمارا بیٹا ہم سے پہلے موجود ہے۔" پپا بھی جائزہ لیتے ہوئے کرسی کھینچ لی تھی۔

امرتا نے حال ہی میں ایک اخبار جوائن کیا تھا۔ تقریباً دو سال ٹریننگ کے بعد اس نے یہاں جاب شروع کی تھی۔ لہٰذا وہ بھی صبح ہی صبح آفس کی تیاری اور ان کی تیاری میں مصروف رہتی تھی۔ تینوں ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد چل پڑے تھے۔ اجے کو اسکول ڈراپ کرنے کے بعد وہ اپنے آفس جا رہے تھے جب ان کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی تھی۔ گولیوں کی آواز نے ارد گرد کے اطراف میں پن ڈراپ سائلنس کی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ خوف ہراس نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ دونوں ایک منٹ میں سرد جسموں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ بے شک انسان اپنی زندگی اور موت سے بے خبر اور لاعلم ہے۔ اجے کے لیے یہ صدمہ کسی صورت برداشت کرنے کے قابل نہ تھا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ اس کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

"بیٹا بس کرو۔" اظہر انکل اس کو چپ کراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"مجھے مما پپا کے پاس جانا ہے۔" وہ روتے ہوئے یہی تکرار جاری رکھے ہوئے تھا۔

"اچھے بچے ایسی باتیں نہیں کرتے۔" وہ اسے بہلا رہے تھے۔
اظہر انکل پپا کے بہت اچھے دوست تھے۔ وہ وکیل تھے۔ سماجی شخصیت ہونے کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے تھے۔ اشوک مہو کی امرتسر میں ہر طرح کی مدد انہوں نے ہی کی تھی۔ انہوں نے اجے کا بہت خیال رکھا تھا۔ اس کی پڑھائی پھر سے شروع کی تھی۔ جس کا سلسلہ چوتھی جماعت سے چھوٹا تھا۔ اظہر انکل کے تین بچے تھے۔ ایک بیٹی دو بیٹے۔ سب پڑھ رہے تھے۔ بڑی بیٹی چھٹی کلاس اور دونوں لڑکے تیسری کلاس میں تھے وہ جڑواں تھے۔ ان کی بیوی بھی اس کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ یہاں وہ کافی حد تک ایڈجسٹ ہو گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی نے شاید اس کا پیچھا کرنا شروع کیا تھا۔ شاید اس کی قسمت میں دربدر کی ٹھوکریں ہی تھیں۔ ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات گاہے بگاہے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں چونکہ اظہر عالم ایک سماجی شخصیت تھے۔ اس لیے ان فسادات میں ان کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہ سیاہ اندھیرے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ نسرین آنٹی تو سکتے کی حالت میں تھیں۔ رونا چیخنا چلانا کچھ بھی نہیں۔ بس خاموش صورت لیے بچوں کو دیکھے جاتی تھیں۔ ان کے بھائی ان کو اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔ پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ اس کو یتیم خانے داخل کر دیا جائے۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ اسے اپنے ایک جاننے والے کے حوالے کر گئے تھے۔
"اب تم اس کے ساتھ رہو گے۔ یہ اچھا آدمی ہے میرا مطلب ہے کہ غلط قسم کا نہیں۔ ذرا غصہ والا ہے پر تم اس کو ناراض نہیں کرنا تو کچھ نہیں کہے گا۔" بشیر اسے ہدایت کرتے ہوئے بولا تھا۔ وہ ایک مکینک کی دکان تھی۔ گاڑیاں ٹھیک کرنا اور ٹھیک کی ہوئی گاڑیوں کو ڈیکوریٹ کرنا ان کا کام تھا۔ لیکن مالک کی سختی اور پھر اس کا یہاں سے نکال دینا اسے دنیا میں ایک بار پھر اکیلا کر گیا تھا۔ اظہر انکل کے گھر گزرے دو سال اسے بری طرح یاد آتے۔ وہ دن وہ لمحے اس کے ذہن سے کبھی محو نہ ہوتے تھے۔ پھر منوج اس کے لیے ایک باپ ایک بھائی بن کر آیا تھا۔ وہ اسے اپنی زندگی میں ایک اہم رشتہ تصور کرتا تھا۔ اس کی ہر بات اس کے لیے اہم مقام رکھتی تھی۔ اس کے دل میں اس کا مقام ایک معزز اور محترم شخصیت کا تھا۔ صرف اس کی اپنی ذات کے لیے۔ دوسروں سے اس کا رویہ کیسا ہے یہ وہ نہیں جانتا تھا پھر ایک دن اس احترام میں بھی دراڑ پڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

چوکیدار کی اطلاع پر کہ شہباز خان آیا ہے وہ چلی آئی تھی۔ وہ باہر برآمدے میں کھڑا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک بڑی چادر پہنے ہی نکلی تھی۔
اسفند یار صبح سے اپنے گھر چلا گیا تھا۔ اپنے ماں باپ سے ملنے۔ اس سے پہلے بھی وہ دو تین بار جا چکا تھا۔ لیکن بہت محتاط ہو کر۔ وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں کا سفر کافی حد تک خطرناک ہوتا تھا۔ اس کو ساتھ لانا لے جانا اس کے لیے دہری تکلیف کا باعث بن سکتا تھا۔ صبح پانچ بجے کا وہ نکل چکا تھا لیکن ابھی تک اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ حد درجہ پریشانی سے وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ کئی بار تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے۔ اب شہباز خان کی بے وقت آمد سے وہ مزید گھبرا گئی تھی۔ کہ اللہ جانے کیا بات ہو۔
"بھابھی جان آپ آیئے میرے ساتھ۔" اسے سامنے دیکھ کر شہباز خان گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تھا۔
"کیا بات ہے؟" اس کا دل دھڑکا تھا۔
"کچھ نہیں بس آپ آیئے۔" شہباز کے چہرے کی رنگت سفید سے زردی مائل ہو چکی تھی۔ الجھن اور پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔
"پلیز بات بتائیں ہوا کیا ہے؟" وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولی تھی۔
کچھ دیر بعد وہ بولا تھا۔ "بات یہ ہے کہ اسفند یار کا

ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں۔ لیکن جو ایک دو ہیں تو وہ گہری ہیں اور چونکہ پاؤں پر ہے۔ اس لیے وہ نہیں آسکتا۔ مجھے فون کرکے آپ کو لانے کا کہا ہے اس نے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ جلدی سے بیٹھ گئی تھی۔ شہباز خان کے ساتھ ایک باڈی گارڈ بھی تھا۔ گاڑی جوں ہی گھر سے نکلی شہباز خان نے اس کی اسپیڈ تیز کردی تھی۔ راستہ بھر عجیب و غریب وسوسے اسے تنگ کر رہے تھے۔ کیوں بے کلی سی ہو رہی تھی۔ وہ جان نہ پا رہی تھی۔ شہباز کی بات پر یقین نہ کرنے کے باوجود یقین کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ "کچھ ہے جو غلط ہے۔" ذہن میں اسی کی تکرار تھی۔ اسے گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ بدستور رو رہی تھی۔ دو سال بعد پورے دو سال بعد وہ اپنے علاقے کی شکل دیکھ پائی تھی۔ گاڑی ان کے گھر کے قریب رک گئی تھی۔ وہاں اسے بہت سے لوگ ادھر ادھر بھاگتے دکھائی دیے تھے۔ دھڑکن کی رفتار انتہائی حدوں تک جا پہنچی تھی۔ "شہباز کیا ہے یہاں؟" وہ سخت لہجے میں بولی تھی مگر وہ چپ تھا۔

"بتاتے کیوں نہیں تم؟" وہ پورے حلق سے چلائی تھی۔ پھر مزید رکے بغیر وہ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے نکلی تھی۔ شہباز بھی جلدی سے اترا تھا۔ فراز خان ان کو دیکھتے ہی ان کی طرف چلے آئے تھے۔

"چچا جان بھابھی آگئی ہیں۔" اس نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فراز خان سے کہا تھا۔

"آؤ بیٹا۔" اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اسے اندر لے آئے تھے۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی اسے رونے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔

"یہ عورتیں کیوں جمع ہیں؟" پھر اچانک ۔۔۔ اچانک ذہن نے کچھ کہا تھا تو پھر بس اس نے دوڑ لگادی تھی۔ دوڑتی ہوئی اس جگہ پہنچی۔ جہاں سب عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ان تک پہنچ کر رک گئی تھی۔ سامنے چارپائی پر سفید چادر کے نیچے جس کی لاش تھی۔ وہ اس سے بے خبر تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر چادر ہٹائی تو۔ وہ اپنے چہرے پر اب بھی وہی نرم مسکراہٹ لیے ہوئے تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔

"نہیں یہ وہ نہیں ۔۔۔ یہ وہ نہیں ہو سکتا۔" ذہن نے تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔

"یہ میرے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔" ایک دم وہ چیخی تھی۔ "نہیں کر سکتے تم ایسا۔ دغا دیا تم نے مجھے۔" وہ تمام تر شدت سے چیختے ہوئے یہی کہے جا رہی تھی۔ اس کی چیخیں رات کے سناٹے میں گھل مل گئی تھیں۔ کس نے کب سہارا دیا۔ کیا ہوا' وہ بالکل غافل تھی۔

آیا تھا ایک شخص میرے درد بانٹنے
رخصت ہوا تو اپنے غم دے گیا مجھے

آج وہ خلاف توقع رمیش کی طرف نہیں گیا تھا۔ وہ صبح سے اپنے گھر پر تھا۔ منوج بھائی کے ساتھ رات دیر تک گپ شپ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ سستی سی وجود پر چھائی رہی۔ اس لیے کہیں جانے کا ارادہ نہ ہو سکا تھا۔

رامو سے ایک کپ چائے منگوا کر وہ اپنے بیڈ پر لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ جب ملازم نے وجنتی کے آنے کی اطلاع دی تھی۔

"اوہ نو۔" وہ منہ بناتے ہوئے بولا تھا۔

"اسے کہو وہ سو رہا ہے۔"

"جی۔" ملازم کے پلٹتے ہی اس نے پھر سے آواز دی تھی۔

"سنو تم نے یہ تو نہیں کہا کہ میں جاگ رہا ہوں؟"

"نہیں صاحب جی۔" "اوکے بس یہی کہو جو میں نے تم سے کہا ہے۔"

اس کے جاتے ہی اس نے کتاب کھول کر پڑھنی چاہی تھی۔ لیکن ذہن بدستور ادھر ہی تھا دو منٹ کے بعد کوئی دروازہ کھولتا ہوا اندر آیا تھا۔

"تو تم سو رہے تھے۔" وجنتی اس کے سر پر کھڑی چلائی تھی۔ "سیدھے سیدھے بول دیتے کہ تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔" وہ خجل ہو گیا تھا۔ کتاب رکھ کر وہ بیٹھ گیا تھا۔

digest library.com

"بیٹھو۔" صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا تھا۔ ساتھ ہی ہاتھ سے اپنے بال ٹھیک کرنے لگا تھا۔

"تھینک یو۔" وہ بیٹھتے ہی بول پڑی تھی۔

"کچھ پیو گی؟"

"نہیں۔" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا تھا۔ "کام تھا کوئی؟" اسے معلوم تھا کہ اسے کیا کام ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی پوچھنا تو کچھ تھا۔ "ہاں۔" وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ہاتھ میں دبے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں پر نظریں جماتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا تھا۔

"آج میں نے تمہیں جتنا مجبور کرنا تھا کر لیا اور مجھے اب یقین ہو چکا ہے کہ تم مجھے کبھی بھی نہیں اپناؤ گے۔" اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکان تھی۔

"میں نے ۔۔۔" اس کی آواز میں واضح لرزش محسوس ہو رہی تھی۔ الفاظ اس کے اندر دم توڑ گئے تھے۔ لیکن اندر کی ہمت اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

"میں نے بہت کوشش کی کہ تمہارے بارے میں نہ سوچوں لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بہت دور چلی جاؤں۔" آواز رندھ گئی تھی۔ "شاید کہ پھر کہیں میں تمہیں بھول پاؤں۔" وہ اس کی طرف بغور دیکھنے لگی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا کچھ سوچتا ہوا۔ "آج اگر تم ایک بار مجھے آزماتے تو میں تمہیں پر خلوص دوست ہی ملتی۔ کم از کم ایک بار تو مجھے آزما لیتے۔" لیکن وہ ہنسی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آئی نمی اب آہستہ آہستہ بہنے لگی تھی۔

"آج ایک دن ایسا آئے گا۔ جب تم مجھے یاد کرو گے بے طرح۔ لیکن میں تمہارے پاس نہ ہوں گی۔ اس وقت تمہیں اندازہ ہو گا کہ تم نے کس طرح میری سچی محبت ٹھکرا دی تھی۔ کیونکہ جن لوگوں نے بھی اسی طرح غرور نخوت سے محبت ٹھکرائی۔ وہ بعد میں کشکول لیے محبت کی بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ ہاں ایک دن ایسا آئے گا۔ جب تم میری باتوں کو یاد کرو گے۔ میں بھگوان سے پراتھنا کروں گی کہ تم بھی میری محبت میں یوں مبتلا ہو کہ میری طرح روتے رہو۔ لیکن تمہارے درد کو محسوس کرنے والا کوئی نہ ہو۔ تم زندہ رہتے ہوئے بھی زندہ نہ رہو۔ تب تمہیں پتہ چلے گا کہ کسی کو ٹھکرا دینے کا صلہ کیا ملتا ہے۔ تمہیں اپنی زندگی پر رونا آئے گا میں یہی دعا کروں گی کہ تمہارے ساتھ ایسا ہو۔ تب میں تم سے پوچھوں گی کہ اب بتاؤ۔ زندہ جسم کے گوشت سے رستا خون کس قدر تکلیف دیتا ہے۔" وہ اٹھی تھی۔ اس کے نزدیک آ کر اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

"مگر اگر تم ایک بار بھی جھوٹ بول دیتے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میں شانت ہو جاتی۔ لیکن تمہارے اندر کا تکبر تمہیں ایسا کرنے نہیں دے رہا۔ مجھے معلوم ہے۔" وہ پست آواز میں روتے ہوئے کہنے لگی تھی۔

"نہیں ہوتی زبردستی محبت۔ لیکن سمجھوتا تو ہو سکتا تھا نا۔ بولو جواب دو مجھے۔" وہ اس کا کندھا زور زور سے ہلانے لگی تھی۔

"بے حس ہو تم۔" وہ چلائی تھی۔ "لیکن میری ایک بات یاد رکھنا۔ زندگی بھر تم مجھے بھول نہیں سکو گے۔" وہ اٹھی تیزی سے کمرے سے نکلتی چلی گئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی کے باعث دھند ہی دھند تھی۔

کئی دن تک وہ ڈسٹرب رہا تھا۔ "تم مجھے بھول نہیں سکو گے۔" کی تکرار اس کے کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ رات دیر تک لان میں ٹہلتا رہا تھا۔

"یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ میں کیا کروں۔" اس نے اپنے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیے تھے۔ اپنے بیڈ روم میں واپس آ کر بھی اسے کسی پل قرار نہ تھا۔ بیڈ پر لیٹ گیا تھا کہ شاید نیند اس پر مہربان ہو جائے۔ لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ بے قراری عروج پر تھی۔ وہ اٹھا اور اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔

"سب خوش ہیں اپنی زندگی عیش میں جیے جا رہے ہیں اور ایک میں 'میں ایسا کیوں نہیں۔'" وہ غصے سے

مٹھیاں بھینچنے لگا تھا۔ عجیب سی وحشت سوار تھی اس پر۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑا گلدان اس نے اٹھا کر زور سے دیوار پر دے مارا تھا وہ ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا تھا ایک دم وہ پھٹ پڑا تھا۔

"برا ہوا ہے میرے ساتھ۔" اس کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

"کیا بگاڑا تھا میں نے کسی کا۔ کیوں ہوا یہ سب میرے ساتھ میں ہی ملا تھا سب کو۔" وہ چیخ رہا تھا۔ وہ جنونی سا ہو گیا تھا۔ جگ اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارا تھا۔ "میں کیا کروں۔" ایک تیز چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔

"میں کیا تھا اور کیا بن گیا ہوں۔ میں کیا ہوں یہ بھولتا جا رہا ہوں میں۔ میں نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا میری پہچان ہی کھو گئی۔ میری ذات ہی گم ہو گئی۔ کیا قصور تھا میرا۔ جو سب مجھے نہیں بخشتے ہر کوئی میرے پیچھے کیوں پڑا ہوا ہے۔"

"کیوں اجے کیا ہوا ہے۔ چلا کیوں رہے ہو؟" منوج بھائی نے شور کی آواز سن کر کمرے میں آ کر جو حالت دیکھی تو پریشان ہو گئے تھے۔

"منوج بھائی۔" وہ چلایا تھا۔ "سب کچھ تو مجھ سے چھن ہی چکا ہے۔ اب یہ مجھ سے سکون بھی چھیننا چاہتے ہیں۔" وہ زور زور سے دیوار پر مکے مارتا جا رہا تھا۔

"ہوا کیا ہے؟ اور یہ کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے اجے کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ پھر اس کو گلے لگا کر تسلی دینے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپک رہے تھے۔

"ہوا کیا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے تو بولو۔ میں اسے دیکھ لوں گا۔" اس کے آنسو ان کی شرٹ کو بھگو رہے تھے۔

"وہ جنتی کہتی ہے کہ وہ مجھے بددعا دے گی۔ کیونکہ میں اس سے محبت نہیں کر سکا۔ وہ جنتی مجھے بددعا دیتی ہے۔ منوج بھائی۔ میں تو کب کا آدھا مر چکا ہوں لیکن وہ مجھے مکمل مارنا چاہتی ہے۔ وہ جنتی کہتی ہے کہ میں روؤں گا تڑپوں گا۔ دیکھو میں رو رہا ہوں۔ میں چیخ رہا ہوں۔ سارا دنیا مجھے بددعا دے مجھے مار دے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی ہے۔ گھن آتی ہے مجھے اپنے آپ سے منوج بھائی تم نہ چھوڑنا مجھے۔" وہ بچوں کی طرح ان سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ "تم مجھے خود سے الگ نہ کرنا ورنہ مجھے وہ جنتی کی بددعا کھا جائے گی۔"

"بس کرو چپ کرو۔" منوج بھائی کی آنکھوں میں موجود قطرے اس کے بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

"منوج بھی تو تھا اجے تمہارے جیسا۔ بہت ہیں ایسے۔ رونے چیخنے چلانے والے۔ کسی کی آواز ہم سن لیتے ہیں۔ اور کوئی اس آواز کو اپنے اندر گھونٹ لیتا ہے۔" وہ دل میں ہی خود سے بول رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اسلام علیکم۔" آج جی کڑا کے وہ آدھمکا تھا۔ کاؤنٹر پر وہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" نہایت بے رخی سے جواب آیا تھا۔

اس نے سرسری نگاہ ڈال کر خود کو کام میں مشغول کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک تو سکندر کو سمجھ نہ آئی تھی کہ وہ کیا کہے۔ جب ہی وہ بول اٹھی تھی۔

"کچھ چاہیے آپ کو؟" آواز میں حد درجہ سختی تھی۔ یوں جیسے مار ڈالنے یا کچا چبانے کا ارادہ ہو۔

"جی نہیں۔" پھر جلدی سے بولا تھا۔ "جی ہاں۔" وہ کنفیوز ہو گیا تھا۔

"کیا؟" شوکیس پر دونوں ہاتھ جما کر قدرے جھک کر سپاٹ نگاہوں سے گھورتے ہوئے اس نے اس کو سچ کہنے پر اکسایا تھا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

"سوری میں دراصل آپ سے ملنے آیا تھا وہ۔۔۔"

"کون ہوتے ہیں آپ مجھ سے ملنے والے۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی تھی۔

"کبھی تم میرے گھر کا چکر کاٹ رہے ہو۔ کبھی تم یہاں میری شاپ کے سامنے چکراتے پھر رہے ہوتے

ہو۔" آپ جناب چھوڑ کر وہ سیدھا سیدھا تم پر اتر آئی تھی۔

"آپ اگر میری بات سن لیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔" اگلے پل وہ اس سے مخاطب تھا۔

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

"پلیز میری بات ایک بار آپ سن تو لیں۔" وہ التجا کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں شاپ بند کر لیتی ہوں۔ تم یہاں بیٹھے رہو۔" وہ جوں ہی نکلنے لگی تھی جب وہ اس کے سامنے راہ روکے کھڑا ہوا تھا۔ چند لمحے تو وہ اس کی جرات پر حیران و پریشان کھڑی رہی تھی۔ جبکہ وہ اپنی نظریں اس کے چہرے پر جمائے خاموش کھڑا تھا۔

"ہٹو یہاں سے۔" وہ سخت لہجے میں بولی تھی۔

"تم سے بول رہی ہوں۔" وہ ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ وہ واپس کاؤنٹر پر چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔ "نہیں مجھے کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا ورنہ تو یہ کمزور سمجھ کر مجھے روز تنگ کرنے آجایا کرے گا۔" وہ خود سے بولتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ آنکھوں میں جمع شدہ پانی کو واپس اندر دھکیلتے ہوئے وہ اس پر چلائی تھی۔ "جاتے ہو یا میں بلاؤں پولیس کو۔" فون کا ریسیور پکڑتے ہوئے اس نے آخری وارننگ دی تھی۔ وہ اس کے قریب آیا تھا۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر کریڈل پر رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو اتنا۔

"مجھ سے بڑھ کر آپ کی حفاظت، آپ کا خیال کوئی نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ پولیس بھی نہیں سمجھیں آپ۔" یہ کہتے ہی وہ اس کی شاپ سے نکل آیا تھا۔ وہ ہکا بکا اس کو جاتا دیکھتی رہی تھی جو قدم بہ قدم اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

پارک میں اسے دیکھ کر اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا تھا۔ بینچ پر بیٹھی ارد گرد لوگوں پر نظریں جمائے وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ آس پاس بچے مختلف کھیل کھیل رہے تھے۔ وہ اس ماحول میں ہوتے ہوئے بھی غائب تھی۔ چند لمحے تو وہ اسے دور سے ہی دیکھتا رہا تھا پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھا تھا۔

"السلام علیکم۔" یکدم مڑ کر اس نے دیکھا تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر ناگواری کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" آواز بمشکل حلق سے نکلی تھی۔ پھر اس نے دیکھا تھا وہ بلا تکلف اس سے ذرا فاصلے پر بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ اٹھ گئی تھی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ بھی اٹھ گیا تھا۔

"پلیز آپ بیٹھیں۔" وہ شرمندہ ہوا تھا۔ وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"تم بیٹھو یہاں کیونکہ پورے پارک میں تمہیں کوئی ایسی جگہ نہیں ملی۔ جہاں تم بیٹھ سکو۔ اس لیے اب جبکہ تمہیں اتنی محنت کے بعد یہ جگہ مل ہی گئی ہے تو تمہیں مبارک ہو۔" وہ سخت لہجے میں ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولی تھی۔ وہ جانے لگی تھی کہ وہ اس کے سامنے چلا آیا۔

"کیا سمجھتی ہیں آپ خود کو۔" وہ سخت طیش میں آ گیا تھا۔

"اگر میری بات آپ سن لیں تو کون سی قیامت آجائے گی۔ بتائیں آپ۔ کبھی کوئی گھٹیا قسم کی حرکت کی ہے میں نے۔ کیا کیا ہے میں نے جو اس قدر روڈ ہو رہی ہیں آپ؟" غصے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ "آپ کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں میں۔ کبھی آپ کے گھر جا رہا ہوں میں تو کبھی آپ کی شاپ پر۔ اگر آپ میری بات سن لیں تو کیا جائے گا آپ کا۔" وہ بے بسی سے بولا تھا۔ اس کا لہجہ بھیگا بھیگا لگا تھا اس پل۔

"کیوں کر رہی ہیں آپ ایسا میرے ساتھ؟" وہ اس سے سوال کرنے لگا تھا۔

"یقین کریں میں کوئی غلط قسم کا بندہ نہیں ہوں۔"

"بس یا کچھ اور بھی کہنا ہے آپ کو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

digest library.com

اس کے ایک ہاتھ میں گلاسز تھے۔ جبکہ دوسرا ہاتھ پینٹ کی جیب میں تھا۔ اس کے چہرے پر نگاہ ڈالنے کے بعد وہ اس کے پاس سے گزرتا ہوا چلا گیا تھا۔

فراز خان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑا بیٹا دبئی کے ایک بینک میں منیجر تھا۔ دوسرا کوہاٹ پوسٹ گریجویٹ کالج میں لیکچرار تھا۔ جبکہ اسفندیار نے اپنا ذاتی انگلش میڈیم اسکول کھول رکھا تھا۔ جو کہ ایک دیہات میں چلا رہا تھا۔ فزکس میں ایم فل کرنے کے بعد اس کے من میں یہی سمایا تھا۔ جس کو اس نے منزل پر پہنچا کر ہی دم لیا تھا۔ دونوں بیٹیوں کی شادی ان کے خاندان میں ہی چچا زاد سے ہو چکی تھیں۔ وٹے سٹے میں دونوں بھابھیاں ان کے گھر میں تھیں۔

وہ ہار گئی تھی۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ زندگی کے مقابلے میں انسان ہار جاتا ہے۔

"اٹھو بیٹا کھانا کھاؤ۔" زینت بی بی نے کمرے میں آ کر جو اسے دیکھا تو دکھ کی ایک لہر ان کے بدن میں اٹھی تھی۔ وہ اپنی بہو کے درد کو سمجھتی تھیں۔ اپنے بیٹے کو کھونے کے بعد ان میں مزید کوئی صدمہ برداشت کرنے کی سکت و ہمت نہ رہی تھی۔ بہو کی ویران اجڑی حالت پر ان کا دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے ہنوز اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے جواب دیا تھا۔ اپنا سر گھٹنوں میں دیے وہ چپ چاپ سی آنسو بہا رہی تھی۔ اسے اردگرد کی کوئی خبر نہ تھی اور نہ ہی جاننا چاہ رہی تھی۔

"بیٹا۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھیں۔ پھر دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ اس کے بالوں میں رینگنے لگا تھا۔ "ایسے نہیں جیا جاتا۔" اس نے دھیرے سے سر اٹھایا تھا۔

"کیسے جیا جاتا ہے؟" آنسو بارش کے قطروں کی صورت گرنے لگے تھے۔

"اماں مجھے جینا سکھا دیں۔ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ مجھے جینا سکھا دیں۔" وہ سسکتے ہوئے ان کے گلے لگ کر اور شدت سے رونے لگی تھی۔

اس کے انتقال کو تین مہینے ہو چکے تھے۔ لیکن ان تین مہینوں میں اس کی حالت میں رتی بھر کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہی کھوئی کھوئی سی کیفیت۔ وہی بکھری بکھری سی۔ زندگی سے وہ روٹھ چکی تھی۔ وہ زندگی کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی نے اس کی زندگی چھینی تھی۔ اسے کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ تھا۔ دن بھر سوچتی رہتی یا روتی رہتی۔

"مجھ سے اس کی یہ اداسی دیکھی نہیں جاتی۔" اس کی چھوٹی نند اپنی بڑی بھابھی سے کہہ رہی تھی۔ آج رات وہ ان کے ہاں رکی تھی۔ اور اپنی بڑی بھابھی کے کمرے میں ہی اس کے سونے کا پروگرام تھا۔ جبھی دونوں ابھی تک باتوں میں مشغول تھیں۔

"بابا جان کہہ رہے تھے کہ اسے واپس بھجوا دیتے

اردو اور انگریزی ادب سے شاہکار انتخاب

عمران ڈائجسٹ

جون 2004ء کا شمارہ شائع ہوگیا ہے

تاریخی ناول

"سلطان اوز خان" معروف مصنف اسلم راہی کے قلم سے تاریخی صفحات۔ عمران کے قارئین کے لیے بطور خاص

تین تہلکہ خیز سلسلے

☆ معروف قلمکار ادیب دانشور رحیم اللہ بیگ کے قلم سے شکاریات کے پس منظر میں شاہکار سلسلہ **"گلریا کا آدم خور"**

☆ ایک نوجوان کی حیرت انگیز داستان جو ننھی سی عمر میں ہی دشمنوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ نیا پُر تجسس سلسلہ **"آتش زادہ"**

☆ حالات کی گود میں پل کر جوان ہونے والے ایک آتش صفت کی حیرت انگیز سرگزشت ایم اے راحت کے قلم سے **"عقاب"**

☆ ادب سے انتخاب

☆ زندگی کے تلخ حقائق سے منتخب "سچی داستانیں"

☆ "گلدستہ" قارئین کی تحریروں سے سجا سلسلہ

اس کے علاوہ بہت سی دلچسپیاں

تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

ہیں امریکہ۔"

"ہاں سنا تو تھا۔" بھابھی اپنے سوئے ہوئے بیٹے کو کمبل میں چھپاتے ہوئے بولی تھیں۔

"بھابھی کیا ان کو اس کے یہاں رہنے پر اعتراض ہے؟"

"نہیں تو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھیں۔

"لیکن بابا جان چاہ رہے ہیں کہ وہ وہاں جائے۔ کیونکہ یہاں کی ہر چیز اسے اسفند کی یاد دلاتی ہے۔ اپنے کمرے میں جب وہ جاتی ہے تو اس قدر چیخ چیخ کر روتی ہے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ان سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ اور میرے خیال سے اس کے لیے اچھا ہے کہ وہ وہاں چلی جائے۔ تبدیلی سے ہی شاید فرق پڑ جائے۔" وہ وضاحت کرنے لگی تھیں۔

digest library.com

☆☆☆

ماں باپ وہ رحمت ہیں کہ جن کے سائے میں انسان جنگلوں بیابانوں میں بھی خود کو تنہا، اکیلا محسوس نہیں کرتا۔ جن کی موجودگی اولاد کا ڈھارس ان کا دلاسا ہوتی ہے۔ اپنے ماں باپ کو سامنے پا کر وہ تو گویا آپے میں نہیں رہی تھی۔ اس کی دلدوز چیخیں اس کی ویران آنکھیں اس کے اندرونی کرب کا احساس دلا گئی تھیں۔ ان کے لمس نے اس کے اندر کی گھٹن کو کھل کر باہر نکالنے کا موقع دیا تھا۔ ماں باپ بیٹی کی اس حالت پر تڑپ اٹھے تھے۔ وہ سب ہال میں جمع تھے۔ وہاں خاموشی تھی۔ اگر آواز تھی تو سسکیوں کی۔ اس جامد خاموشی کو زینت بی بی کی آواز نے توڑا تھا۔

"بھائی صاحب کتنا عرصہ قیام ہے یہاں؟" آواز بمشکل حلق سے نکلی تھی۔

"ایک مہینہ۔" مختصر جواب دیا گیا تھا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی تھیں ان کے جواب پر۔ چند لمحے بدستور خاموشی چھائی رہی تھی۔ جسے دوبارہ زینت بی بی کی آواز نے توڑا تھا۔

"بیٹی کو سمجھاؤ کہ جو دکھ ملنا ہوتا ہے۔ وہ مل کے رہتا ہے۔ اس سے خلاصی پانا ممکن نہیں۔ جب میں اس کی موت پر صبر کر سکتی ہوں کہ وہ جس کو میں نے ان ہاتھوں سے کھلایا پلایا تھا۔ بڑا کیا تھا۔ میرے سامنے لاش کی صورت پڑا ہوا تھا اور میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے پچیس چھبیس سال گزارے تھے اس کے ساتھ۔ جب میں صبر کر سکتی ہوں تو۔۔۔" وہ چپ ہو گئی تھیں۔ چند لمحے بعد بولی تھیں۔

"جسے جانا ہوتا ہے۔ اسے ہم نہیں روک سکتے۔"

"بیٹا، تمہاری چچی صحیح کہہ رہی ہیں۔" اب کے مخاطب ماں تھی۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہولے ہولے دبا رہی تھیں۔ "مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ تم یہ بات مان لو کہ وہ چلا گیا ہے۔ اب وہ واپس نہیں آ سکتا۔ اگر کچھ کرنا ہے تو اس کے ایصال ثواب کے لیے کلام پاک پڑھو۔ اس کی روح کو ثواب پہنچاؤ۔ جو کچھ تم کر رہی ہو اس سے اس کو تکلیف ملے گی۔ اور کچھ نہیں۔" پھر وہاں موجود بہت سی آوازوں نے اس سے کچھ کہا تھا۔ لیکن وہ کسی کی بات سن نہ پائی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ وہ مما کے ساتھ اس کے ایصال ثواب کے لیے کلام پاک پڑھنے لگی۔ وہ شوخی و شرارت جو اس کے ہونٹوں پر رہتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے اس حقیقت سے سمجھوتا کر لیا تھا کہ اب وہ واپس نہیں آ سکتا۔ اس کے چیخنے چلانے کے باوجود۔

☆☆☆

ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھے وہ اپنی زندگی کے ان تین سالوں کو سوچ رہی تھی جو اس نے یہاں گزارے تھے۔ اب وہ بھیڑ بھاڑ اور ہجوم سے نکل کر لق ودق صحرا میں کھڑی تھی۔ ایک ایسا مقام کہ جہاں سے وہ نہ آگے جا سکتی تھی نہ پیچھے۔ اس کی زندگی جمود کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ خود کو کھونے لگی تھی۔ شادی کے آٹھویں مہینے میں وہ واقعہ پیش آیا تھا کہ جس نے اس کی زندگی کی خوشیوں میں زہر گھول دیا تھا۔

اسفند کا اسکول گاؤں میں تھا۔ جو ان کے گھر سے

تقریباً" پچیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ان کا گھر شہر سے نسبتاً" دور پر سکون جگہ پر واقع تھا۔ ارد گرد ان کے اپنے کھیت اور باغات تھے۔ صرف ایک باغ اچھی خاصی مالیت کا تھا۔ جس میں تقریباً" ہر قسم کے پھلوں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ اس کی عادت تھی اسکول سے واپس آکر کھانے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے سوجاتا تھا اور شام میں باہر دوستوں کے ساتھ نکل جاتا تھا۔ وہاں سے واپسی رات نو' دس بجے تک ہوتی تھی۔ یہی اس کی روٹین تھی۔ اس دن بھی وہ حسب معمول شام کے وقت گھر سے نکلا تھا۔ اور خلاف توقع سات بجے ہی واپس آگیا تھا۔ سردیوں کے دن تھے وہ کچن میں مصروف تھی۔ ساتھ ہی بڑی بھابھی بھی کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔ اسے آتا ہوا وہ دیکھ چکی تھی۔ لیکن مصروفیت کے باعث اس کے پاس نہیں گئی تھی۔ کچھ دیر بعد بابا جان کے کمرے سے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ بھابھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر کچھ لمحے کچھ سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں۔ پھر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنے کے سے انداز میں ان کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے کانوں سے یہی جملہ ٹکرایا تھا کہ۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" یہ بابا جان کی آواز تھی۔ دفعتاً" اس کی نظریں اس پر پڑی تھیں۔ وہ اپنا سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

"لیکن تمہیں کیا ضرورت تھی ان کے جھگڑے میں دخل دینے کی۔" بابا جان بہت برہم تھے اس پر۔ تب غیر ارادی طور پر اس کی نظر اس کی شرٹ پر پڑی تھی۔ وہ چونک گئی تھی۔ اس کی قمیص پر جگہ جگہ دھبے تھے خون کے۔ وہ لرز گئی تھی۔

"تو کیا؟" وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ بابا جان کی بات پر اس نے یکدم اپنا سر اٹھالیا تھا۔

"بابا جان وہ اس کو مارنا چاہتا تھا اور۔"

"اور تم نے اسے مار دیا۔" بابا جان نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"بابا جان میں ان میں صلح کرانا چاہتا تھا۔ ان دونوں کو منع کر رہا تھا جھگڑا کرنے سے۔" اس کی آواز میں بیچارگی تھی' بے بسی تھی۔

"کون یقین کرے گا تمہاری بات پر؟" اب کے وہ اس سے سوال کر رہے تھے۔

"بابا جان یقین تو آپ بھی نہیں کر رہے اور کس سے توقع کروں گا۔" وہ بڑے دکھ سے بولا تھا۔ اس لہجے میں کچھ تھا جو وہ پگھل گئے تھے اور قدرے نرم پڑ گئے تھے۔

"بیٹا میرے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہ ہوگا' بات تو ساری یہ ہے کہ وہ سب یقین کریں۔" وہ بہت الجھے ہوئے تھے پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ بڑی بھابھی' چھوٹی بھابھی' سرفراز خان' اماں سب ایک ایک کر کے کمرے میں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اماں شاکڈ ہو گئی تھیں یہ سن کر کہ وہ۔ پھر وہ بیڈ پر سے اٹھا تھا۔ اور صوفے پر بیٹھی ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آواز بہت بھیگی اور رندھی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بولا تھا۔

"اماں آپ یقین کریں میں ان دونوں کو باز رکھنا چاہ رہا تھا۔ لیکن۔۔۔" کچھ توقف بعد بولا تھا۔ "محمود نے تو میری بات مان لی تھی۔ وہ قدرے نرم پڑ گیا تھا۔ لیکن ندیم وہ ایسا نہیں کر رہا تھا۔ محمود کا ہاتھ پکڑ کر میں نے اسے اپنے پیچھے کر لیا تھا۔ ندیم کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ اس خنجر سے بار بار محمود پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا۔ میں اس کا ہاتھ روک لیتا۔ پھر جوں ہی اس نے محمود کے پیٹ میں خنجر اتارنا چاہا۔ میرا ہاتھ خنجر پر پڑ چکا تھا۔ پھر میرے ہاتھ کی گرفت خنجر پر سخت ہو گئی تھی۔ ندیم اسے میری گرفت سے نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے ہاتھ بہت مضبوطی سے خنجر پر جمے ہوئے تھے۔

"ہٹو اسفند ورنہ اسے چھوڑ کر میں تمہارے اندر یہ خنجر اتار دوں گا۔" وہ غصہ سے پھنکارا تھا۔

"اسے کیوں دھمکا رہے ہو۔ مقابلہ تمہارا میرے ساتھ ہے۔ اس کے ساتھ نہیں۔" محمود غرایا تھا۔

"مرد ہو تو میرے ساتھ بات کرو۔" اس کی آواز میں

digest.library.com

چیلنج تھا۔

"چھوڑ مجھے۔" اسفند کو خود سے چھڑاتے ہوئے وہ چیخ پڑا تھا۔

"اب بتاتا ہوں میں تجھے۔" ایک بھرپور وار کرتے ہوئے اس نے خنجر محمود کے پیٹ میں اتارنا چاہا۔ لیکن وہ اس کے سینے میں دائیں جانب لگا۔ لیکن ذرا سے گوشت کو چیرتے ہوئے ہی لگا تھا۔ اس کے سینے سے ابلتے خون کو دیکھ کر اسفند اپنے حواس کھو چکا تھا۔ اس کو محسوس ہوا تھا کہ محمود کو شدید نوعیت کی چوٹ آئی ہے۔ جوں ہی ندیم نے دوسرا وار کرنا چاہا تو وہ اس کے ہاتھ سے خنجر چھیننے لگا۔

"میرا اس کے خنجر چھیننے کے دوران پتہ نہیں کیسے وہ اس کے اندر گھس گیا تھا۔ اماں مجھے کچھ نہیں پتا کہ وہ کیسے ہوا خنجر۔۔۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھا اور میں اپنے سامنے خون میں لت پت ندیم کو دیکھتا رہا۔ شور کی آواز سن کر سامنے والے گھر سے ایک آدمی نکل آیا تھا۔ لیکن وہ بھی ندیم کے گھر والوں کو بلانے کے لیے دوڑتا ہوا گیا تھا۔ محمود نے جب ندیم کو اس حالت میں دیکھا تو وہ بوکھلا گیا تھا اور وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ ندیم کا بھائی بھاگتے ہوئے آیا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے ہجوم بڑھنے لگا تھا۔ میں وہاں بیٹھا اپنے حواس کھو چکا تھا۔ خالد (ندیم کا بھائی) اس کو اپنے سینے سے لگائے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ۔" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

"اماں وہ خالد کو بتانا چاہتا تھا کہ میں نے۔۔۔ اس نے کہا تو یہ کہ۔" وہ رک رک کر بولتے ہوئے کہے جا رہا تھا۔

"اس نے کہا تو یہ کہ بھائی اسفند نے۔۔۔" پھر اس کے بھائی نے بھرے ہجوم میں مجھ پر اپنی آنکھیں جما دی تھیں۔

"تیری تو۔۔۔ ابھی دیکھتا ہوں تجھے۔" بھائی کو چھوڑ کر وہ میری طرف لپکا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے روک لیا تھا۔ وہ ان کی قید میں پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔ وہ چیختا جا رہا تھا۔

"دیکھوں گا میں تمہارے ساتھ۔ کیسے بچو گے تم میرے ہاتھوں۔" میں سر جھکائے ہوئے تھا۔

اس کی بات پر ندیم نے اپنا سر نفی میں ہلایا تھا۔ اماں وہ بھائی کو اشارے کر رہا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا۔ اماں وہ اسے میرے بے گناہ ہونے کا بتا رہا تھا۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں میں واضح دکھ دیکھا تھا۔ اماں اس نے مجھے بہت کرب آمیز نظروں سے دیکھا تھا اور پھر مجھے بھاگ جانے کا اشارہ کیا تھا۔ جبکہ خالد مسلسل چیخ رہا تھا۔ تب میں نے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی۔ وہاں موجود چند دوسرے لوگوں نے بھی مجھے بھاگنے کو کہا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت خالد میرے خون کے درپے تھا۔ اماں ہم تین بندے ہی جانتے ہیں کہ میں نے جانتے بوجھتے ایسا نہیں کیا تھا۔ جو زندہ ہے وہ چھپ گیا ہے۔ اور جس نے مجھے معاف کر دیا تھا وہ زندہ نہیں رہا۔ اماں میں وہاں سے بھاگ آیا تو یہ سوچ کر کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں اپنے بے گناہی ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ اماں میں نے خالد کی آنکھوں میں نفرت و حقارت دیکھی تھی۔ شدید نفرت۔ اگر وہاں ہجوم نہ ہوتا اور اگر اسے کوئی بھی چیز مل جاتی تو یقیناً" وہ مجھے وہیں ڈھیر کر دیتا۔" اماں نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا۔

"اور ندیم کہاں ہے اس وقت۔" اماں کی درد میں ڈوبی آواز ابھری تھی۔

"اسے ہسپتال لے جانے کے لیے کچھ لوگ گاڑی لانے گئے تھے۔" رندھی اور بھیگی آواز میں وہ بولا تھا۔

پھر وہ وہاں سے درہ آدم خیل چلے گئے تھے۔ پوری فیملی چلی گئی تھی۔

بہت جان جوکھوں کے بعد وہ جرگے میں بیٹھنے پر تیار ہو گئے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے بہت پاپڑ بیلے تھے تبھی یہ جرگہ ممکن ہوا تھا۔ لیکن اسفند کو یہ بات پتہ چلی تھی کہ خالد نہیں چاہتا کہ ان کا راضی نامہ ہو۔ کیونکہ اس نے جس بھائی کو اپنی آنکھوں سے مرتے دیکھا تھا۔ اس کے قاتل کو بھلانا اس کے لیے آسان نہ

تھا۔ لیکن پھر سننے میں یہ بات بھی آئی تھی کہ اب وہ مان گیا ہے باپ کی التجاؤں کی وجہ سے۔ وہ اچھے خاصے شریف لوگ تھے۔ خوامخواہ کی جنگیں فساد پسند نہیں کرتے تھے۔ ندیم اور محمود کی شروع ہی سے نہیں لگتی تھی۔ بات بے بات ان کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ جو آخر کار اتنی بڑی تباہی کا باعث بنی تھی۔ ان کے راضی نامہ ہوتے ہی وہ لوگ درہ چھوڑ آئے تھے اور دوبارہ سے کوہاٹ میں اپنے گھر میں رہنے لگے تھے۔ خالد دبئی چلا گیا تھا۔ جرگہ میں کسی بھی فریق کی خلاف ورزی کرنے کی قیمت پانچ لاکھ روپے تھی۔ ماں باپ کے ایما پر کہ جب ندیم کے گھر والے اسفند کو دیکھیں گے تو ان کا خون جوش مار سکتا ہے علاقہ غیر چلا گیا تھا اپنی بیوی سمیت۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کے آخری دو سال گزارے تھے۔ اور دو سال بعد خالد نے بدلہ لے ہی لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آجے ادھر آؤ۔ میرے کمرے میں مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" منوج کے چہرے پر پریشانی کے آثار واضح تھے۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے اس کے بیڈ روم میں آیا تھا۔

"بیٹھو" خود بیڈ پر بیٹھ کر انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جبکہ بیڈ پر ساوتری لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے بیمار تھیں۔ اس وقت بھی ان کی طبیعت بوجھل سی تھی۔

"دیکھو تم سوچ سمجھ کر مجھے جواب دو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا فیصلہ وہ ہو جو میرا ہے۔" وہ کچھ توقف بعد بولے تھے۔

"موہن راج تمہیں دیکھ چکا ہے میرا مطلب ہے کہ اپنی بیٹی کی شادی پر تم سے بات چیت کے بعد اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم بہت ذہین اور جینئس ہو۔ وہ تم سے بہت متاثر ہوا تھا اور چاہتا ہے کہ تم اس کے ساتھ کام کرو۔ جبکہ میں اس سے یہی کہہ چکا ہوں کہ میں تمہاری منشا پر چھوڑوں گا۔ میں اس سے یہ بھی کہہ چکا ہوں کہ تمہاری تعلیم جب تک مکمل نہ ہوتی۔ میں تمہیں کوئی بھی کام نہیں کرنے دوں گا۔ تم بتاؤ کیا خیال ہے تمہارا؟ جبکہ میرا خیال یہ ہے کہ تم کسی بھی قیمت پر اس لائن میں نہ آؤ۔" ساتھ ہی منوج نے اسے اپنے خیال سے آگاہ کیا تھا۔ اجے نے ان کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تھا۔ وہاں اسے پریشانی میں چھپی محبت جھلکتی نظر آئی تھی۔ وہ اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ اپنا سر اس نے ان کے گھٹنوں پر رکھ دیا تھا اور کہا تھا۔

"آجے کچھ نہیں اگر کچھ ہے تو وہ منوج ہے۔" منوج نے خوش ہو کر اسے گلے لگایا تھا۔

"ادھر آؤ۔" ساوتری اسے بلا رہی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بیڈ پر بٹھا لیا تھا۔ پھر بیٹھتے ہوئے انھوں نے اس کا سر نیچے کر کے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ پھر اشک گالوں کو بھگونے لگے تھے۔ اجے نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے ان کے آنسو صاف کیے تھے اور انھیں اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے بولا تھا۔

"میں اس قابل نہیں ہوں۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"تم کس قابل ہو یہ مجھ سے پوچھو۔" منوج بھائی نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کے جانے کا سارا بندوبست منوج بھائی نے کر لیا تھا جو وہ تاریخ کو اس کی فلائٹ تھی۔ فلائٹ کا وقت رات ایک بجے کا تھا۔ جانے سے دو دن قبل وہ اپنے تمام دوستوں سے ملا تھا۔ انجلی تو باقاعدہ اس کے جانے کا سن کر پچھلے تین گھنٹے سے وقفے وقفے سے رو رہی تھی۔ اب تو نوبت یہ تھی کہ وہ اسے چپ بھی نہیں کرا رہا تھا۔ تھک گیا تھا وہ۔

"میں مر تھوڑی گیا ہوں جو اس قدر رو رہی ہو۔" وہ جھنجلا گیا تھا۔

digest library.com

"کیا دوست نہیں روتے؟" وہ چلاتے ہوئے بولی تھی۔ پھر اپنی دائیں آستین سے ناک رگڑتے ہوئے بولی تھی۔

"ویسے وجنتی کو پتہ ہے کہ تم جا رہے ہو۔"

"نہیں۔" اس کی نظریں سامنے سرخ گلاب کے پودوں پر تھیں۔ اس وقت وہ انجلی کے گھر پر اس کے لان میں بیٹھا تھا۔ پھر اپنی نظریں وہاں سے ہٹا کر صرف اتنا بولا تھا۔

"کل کا دن میرا وجنتی کے ساتھ ہے۔" جبکہ وہ حیرت کے مارے بے ہوش ہونے کو تھی۔

"کیا۔۔۔ وجنتی کے ساتھ؟" وہ پورے حلق کے بل چیخی تھی۔

"ہاں۔" اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"اس کے لیے میرے پاس یہ ایک دن ہے جو کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں اسے دے سکتا ہوں۔ ایک دن کی عارضی خوشی عارضی ساتھ اور پھر میرے خیال سے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" وہ اس کی تائید چاہ رہا تھا۔ اس نے حیرانگی سے اپنا سر ہلایا تھا۔ گویا اس کی تائید کر رہی تھی۔ حیرت و خاموشی کے ساتھ۔

پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ سارا دن اس نے وجنتی کے ساتھ گزارا تھا۔ وجنتی حیرت میں ڈوبی اس کی اس مہربانی پر نثار ہو گئی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ بہترین ہوٹل میں لنچ کیا تھا۔ اسے اس کی پسند کی آئسکریم کھلائی تھی۔ لانگ ڈرائیو کی تھی بہت ساری باتیں جو وجنتی کے دل میں جانے کب کی جمع تھیں۔ وہ نکال رہی تھی۔ کچھ ان کہی باتیں۔ کچھ کہی باتیں۔ کچھ خاموشی۔ کچھ کھلکھلاہٹیں۔ اس نے زیادہ تر سنا ہی تھا۔ وجنتی کے چہرے پر پھیلی خوشی، اطمینان و بے چینی کے ملے جلے رنگوں نے اس کے دل میں ایک اطمینان بھر دیا تھا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے ایک دن کی ہی سہی یہ خوشی اس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ اس کے گھر پر اسے اتارتے ہوئے اس نے وجنتی کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آئی نمی وہ دیکھ چکا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ باہر نکلا تھا۔ وہ ٹھری ہی گاڑی کے اوپری سطح پر ہاتھ رکھے۔

"وجنتی Ajay loves you۔" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس نے دوستانہ انداز میں کہا تھا۔ اور اس پل وجنتی خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ جسے بار بار وہ اپنے ہاتھوں سے صاف کر رہی تھی۔ اجے نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کیے تھے اور پھر واپس پلٹا تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ سے اس نے کچھ نکالا تھا۔ پھر اس کے قریب آ کر بولا تھا۔

"یہ تمہارا گفٹ ہے میری طرف سے۔ ہے تو چھوٹا سا لیکن تمہیں پسند آئے گا۔" وہ دم بخود اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"او کے اب میں چلتا ہوں۔" اسے کھویا کھویا دیکھ کر وہ یکدم بولا تھا۔ اس نے گلاسز اپنی آنکھوں پر چڑھا لیے تھے۔ واپس گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ ہلایا تھا۔ جس کا جواب وجنتی نے خاموشی کے سوا کچھ نہ دیا تھا۔ گاڑی اس کے پاس سے ہوتے ہوئے چلی گئی تھی۔

انجلی شام میں دوبارہ ان کے ہاں آئی تھی۔ ساتھ میں رمیش بھی تھا۔ وہ اس کے منہ سے وجنتی کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ اور اس نے پوری تفصیل بتا بھی دی تھی کچھ باتوں کو سنسر کر کے۔

"کیا تم نے اسے بتا دیا کہ تم امریکہ جا رہے ہو؟" تمام تفصیل سننے کے بعد انجلی بولی تھی۔

"نہیں۔" کچھ دیر بعد وہ بولا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں بتایا۔ پتہ نہیں کیوں میں اسے بتا نہیں پایا۔" وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"منوج بھائی تو بہت اداس ہوں گے؟" اب کی بار امیش بولا تھا۔

"پتہ نہیں وہ ظاہر نہیں کرتے۔" مختصر جواب دیا تھا اس نے پھر رمیش اور انجلی۔ منوج بھائی کے ساتھ اسے ایئرپورٹ چھوڑنے آئے تھے۔

منوج بھائی کے گلے لگتے ہوئے اس کی آنکھیں نم

ہو گئی تھیں۔ پھرباری باری رمیش اور انجلی سے بھی وہ ملا تھا۔ تینوں سے مل کر جاتے سمے اس کے قدم بہت بوجھل تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے بدن سے کسی نے روح نکال دی ہو۔ وہ پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جبکہ دیکھنے والے اس کے پلٹ کر آنے کے خواہش مند تھے۔

زندگی کی پرواز انسان کو کس جگہ لا پھینکتی ہے یہ تو آنے والا وقت بتاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک وقت میں ایک جیسا ہی ہو رہا ہوتا ہے شاید تقدیر اسی کو کہتے ہیں۔ نامعلوم سمت کے نامعلوم مسافر۔

☼ ☼ ☼

نیویارک ایئرپورٹ پر جب وہ اتری تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں پہلی بار آئی ہو۔ حالانکہ وہ یہیں پلی بڑھی تھی۔ اسے اپنا آپ اکیلا محسوس ہو رہا تھا۔ سب کچھ جامد و ساکت وہ اپنے قریب سے گزرتی لڑکی جو اپنی ساتھی لڑکی کی بات پر قہقہہ لگا گئی تھی کو دیکھ کر رہ گئی تھی۔ وہ اس کے بے ساختہ قہقہے پر رشک کرتی رہی تھی۔

"آؤ بیٹا۔" مما پپا اسے لیے باہر آئے تھے۔ گھر تک کا فاصلہ کیسے کب طے ہوا۔ وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ جانتی تھی تو صرف اتنا کہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ کسی معجزے کی آس بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہ اداس ہو گئی تھی اس خاتمے پر۔

"سب کچھ ویسا ہے پر تم نہیں ہو۔" گاڑی سے اترتے ہوئے وہ خود سے بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

مشی گن کے شہر میں زندگی کی چہل پہل اور رونق دیکھنے کے قابل تھی۔ یہاں باخیریت پہنچتے ہی اس نے منوج بھائی اور انجلی کو فون کیا تھا۔ فی الحال اس کا قیام ہوٹل میں تھا بعد کے بارے میں اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔

منوج بھائی نے اسے روپے پیسے کی فکر نہ کرنے کو کہا تھا وہ یہ کہہ چکے تھے کہ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے اسے روپے بھیجا کریں گے۔ لیکن وہ خود بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک دکان پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ دیگر چیزوں کی خرید و فروخت کی نسبت اسے بک سیلنگ اچھی اور انٹرسٹنگ لگتی تھی۔ سات مہینے وہ اسی دکان پر کام کرتا رہا تھا۔ اس نے ایک فلیٹ کرایہ پر لیا تھا۔ منوج بھائی کی طرف سے رقم باقاعدگی سے مل رہی تھی۔ اگرچہ وہ اسے منع بھی کر چکا تھا کہ وہ خود کمانے لگا ہے۔ لیکن وہ مصر تھے کہ اس کی بھیجی گئی رقم وہ اپنے استعمال میں لائے ورنہ وہ اسے اپنا بیٹا نہیں سمجھیں گے۔

ایک دن اس کی ملاقات سروش کمار سے ہوئی تھی۔ سروش کمار منوج بھائی کا دوست تھا۔ اجے کو یہاں دیکھ کر وہ بہت خوش اور حیران زیادہ ہوا تھا۔ پھر اس نے اسے اپنے جنرل اسٹور کا نگران مقرر کیا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں سیٹ ہونے کے باوجود سیٹ نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک دن جب وہ کام سے واپسی پر آ رہا تھا۔ اس نے ایک امریکن کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی دس سالہ بیٹی کے ہمراہ مسجد سے نکل رہا تھا۔ اس کی بیٹی نے اسکارف اوڑھا ہوا تھا۔ جبکہ وہ خود بھی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ شکل سے اسے وہ سو فیصد امریکن لگ رہا تھا۔ لیکن اس کا حلیہ اس بات کا غمازی تھا کہ وہ مسلمان تھا۔ چند دن بعد اس نے دوبارہ اس وقت اس کو مسجد سے نکلتے دیکھا تھا۔ آج کچھ پوچھنے کا ارادہ کرتے ہوئے اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی تھی۔ اس کے نکلتے ہی وہ گاڑی سے نکل کر ان کی جانب لپکا تھا۔

"لسن ٹومی، آر یو مسلم؟" انگریزی میں پوچھے گئے اس سوال پر پہلے تو وہ ہلکا سا مسکرایا تھا پھر بولا تھا۔

"یس۔" اس کے بعد وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ دونوں دور تک اس کی نگاہوں کے حصار میں رہے تھے۔

کچھ دن بعد وہ دوبارہ ان کے روبرو تھا۔ اب کی بار تو

digest.library.com

اس نے حد کردی تھی۔ اپنی عجیب سی حرکتیں خود اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔

"کیا میں آپ کے ساتھ اندر جا سکتا ہوں؟" وہ حیرت زدہ ہو گیا تھا۔

"یہ مسجد میری نہیں ہے۔ کوئی بھی اندر جا سکتا ہے" کچھ دیر بعد وہ بولا تھا۔ پھر اجے نے دیکھا تھا اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ اس نے قدرے چونک کر پوچھا تھا۔

"کیا تم مسلمان ہو؟"

"نہیں۔" اجے نے اپنا سر نفی میں ہلایا تھا۔

"پھر تم نہیں جا سکتے۔" انگریزی میں جواب دیتا وہ اپنی بیٹی سمیت مسجد کے اندر چلا گیا تھا۔

اور آج اس نے اس سے بات کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ گاڑی بند کر کے اسٹیرنگ پر ہاتھ جمائے وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ پرسوچ نگاہوں سے وہ اردگرد کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ دس منٹ ہو چکے تھے اس کو یہاں انتظار کرتے ہوئے۔ اس کا یہ انتظار اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔ کچھ دھیرے دھیرے وقت سرکا تھا۔ آخر اس نے مزید وقت گزارنے کے بجائے جانے کا سوچ کر گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ اسی اثناء میں اس کی نظریں مسجد سے نکلتے ان دونوں پر پڑی تھیں۔ وہ جلدی سے گاڑی سے نکلا تھا۔ اور تیز تیز قدموں سے ان کی طرف بڑھا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔" وہ رک گیا تھا۔ لیکن خاموش ہی رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اُمڈتی حیرت کو نظرانداز کر کے اس نے اس کے گھر کا پتہ پوچھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا۔ اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ پھر قدرے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیوں؟"

"ویسے ہی میں..." اجے نے قدرے ہکلا کر کچھ کہنا چاہا تھا۔

"اگر آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے۔ تو آپ ابھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن میرے گھر جانے کی بات کچھ میری سمجھ میں نہیں آئی۔" اس نے کافی ترش لہجے میں ہی کہا تھا۔

"دراصل مجھے آپ سے تفصیلاً" بات کرنی ہے۔ اس لیے میں چاہ رہا تھا کہ میں آپ کے گھر آؤں۔" اجے کی بات پر اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ کچھ دیر تک اس کے چہرے پر کچھ کھوجتا رہا تھا۔ تلاش کرتا رہا تھا۔ پھر یکلخت بولا تھا۔

"شام سات بجے آجانا میں اس وقت گھر پر ہوں گا۔" پھر اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے اس میں سے ایک کارڈ نکالا تھا اور اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑے جوں ہی اس نے قدم بڑھائے تھے۔ اپنے پیچھے اس نے "تھینک یو" کے الفاظ سنے تھے۔

دوسرے روز وہ اسی وقت (جو اس نے دیا تھا) ان کے گھر پر تھا۔ اس کے دو بیٹے اور بھی تھے جن کی عمریں بالترتیب چار سال اور آٹھ ماہ تھیں۔ اس کا گھر کافی بڑا تھا۔ اسے اس کے گھر میں جو چیز سب سے زیادہ اچھی لگی تھی وہ ان کا لان تھا۔ گھر کے باہر سرسبز و شاداب اور دنیا کے ہر قسم کے خوب صورت پودوں اور پھولوں سے آراستہ باغیچہ۔ اس کی تعریف اس نے عبداللہ (اس کی زبانی ہی نام پتہ چلا تھا) کے سامنے کر بھی دی تھی۔ جو اس نے نہایت شرم آمیز مسکراہٹ سے وصول کی تھی۔

اس کی بیوی اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کے اپنے اندازے کے مطابق وہ غالباً "پردہ کرتی تھی۔ اس کی خاطر تواضع اس نے کافی خوش اخلاقی سے کی تھی۔

"کس سلسلے میں تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟" آخر وہ سوال لبوں پر آ ہی گیا تھا جو کل شام سے اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ کل شام سڑک پر روک کر اس نے اس کا ایڈریس مانگ کر اسے ٹھیک ٹھاک حیرت زدہ کر دیا تھا۔

"پتہ نہیں یہ بات تمہیں کیسی لگے گی لیکن۔" اپنے اندر ہمت و حوصلہ مجتمع کر کے بولا تھا۔

"لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ مذہب کیوں اپنایا؟ کیا چیز تمہیں اس مذہب کے قریب لے

گئی؟" اس کی آواز میں عجیب سی رقت تھی۔ جسے عبداللہ محسوس کر گیا تھا۔ تبھی اس کے چہرے کا اچھی طرح جائزہ لیتے ہوئے بولا تھا۔

"یہی جاننا چاہتے ہو کہ میں مسلمان کیوں ہوا' ہے نا۔" پھر دوسرے ہی پل بولا تھا۔

"جارج برنارڈ شا کہتا ہے۔" انسان پاگل ہے کہ وہ ایک پتا یا چیونٹی تک تو بنا نہیں سکتا لیکن بیسیوں خدا بنا لیتا ہے۔" سچ کہتا ہے وہ۔ ایک پتا تک نہ بنانے والا انسان بیسیوں خدا بنا لیتا ہے۔" وہ استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا تھا۔

"میں میجر تھا آرمی میں۔ اب تو خیر چھوڑ دی یہ جاب۔ اب سے مراد پچھلے تین سال سے۔ میں جی رہا تھا۔ ایسے ہی جیسے سب جیتے ہیں۔ میں اپنے جیسے نارمل بندوں کی بات کر رہا ہوں۔ پھر میں ملا ایک ایسے انسان سے۔ جس نے میری زندگی بدل کر رکھ دی۔ میں اس سے ایک پاکستانی دوست کے توسط سے ہی ملا تھا۔ وہ تبلیغی دورے پر آیا تھا۔ میرا وہ دوست اس سے ملنے کو بے چین تھا اور میں محض وقت گزاری کے لیے اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ وہاں اس کے گرد لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ پھر اس کا درس جو وہ دے رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ کسی اور زبان میں تھا۔ لیکن اس کی آواز' اس کے لہجے میں مٹھاس' اس کی رقت آمیزی' اس کے آنسو۔ اس کا نورانی چہرہ' لوگوں کا بلک بلک کر رونا یہ سب مجھے عجیب سی تبدیلی میں مبتلا کر گیا تھا۔" وہ کچھ دیر کے لیے ان لمحات میں کھو گیا تھا۔

"تم یقین کرو۔" دوسرے پل وہ اس سے گویا ہوا تھا۔ "میرے اندر کچھ ہو گیا تھا۔ پھر رات بھر وہ آواز مجھے ڈسٹرب کرتی رہی تھی۔ دوسرے دن میں دوبارہ احمد کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا۔ مجھے نہیں پتہ کیا چیز مجھے وہاں لے گئی تھی؟ لیکن میں جاننا چاہتا تھا۔ کچھ کھوجنا چاہتا تھا۔ میرے اصرار پر کہ درس انگلش میں دیا جائے۔ تو اسی زبان میں دیا گیا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا کہہ کر لوگوں کو رلاتا ہے؟ کیا ہے جسے سن کر لوگ رو پڑتے ہیں؟ لیکن تمہیں حیرت ہو گی۔ جب وہ بولنے لگا تھا۔ تو میرے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ رونگٹے کھڑے ہونا کیا ہوتا ہے۔ یہ اس کی باتیں سن کر مجھے معلوم ہوا۔ اس کی شخصیت اس کی آواز میں کچھ تھا میں نے آج تک کسی کی آواز میں وہ مٹھاس محسوس نہیں کی۔ جو اس کی آواز میں ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو وہ روتا ہے۔ جب وہ روتا ہے تو سارا مجمع روتا ہے۔ وہ اندر سے ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی باتیں یہاں۔" وہ اپنا ہاتھ اپنے دل پر مارتے ہوئے بولا تھا۔ "یہاں اثر کرتی ہیں۔ لوگ جوق در جوق اس سے ملنے' اس کی باتیں سننے اڈتے چلے آتے ہیں۔ وہ جو کہتا ہے وہ کرتا ہے۔ وہ' وہ نہیں کہتا۔ جو وہ نہیں کرتا۔ وہ عمل کرتا ہے۔ خالی خولی باتیں نہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے۔

"جو تم کرتے نہیں ہو وہ کہتے کیوں ہو۔" لیکن وہ ایسا نہیں ہے۔ ایسا بندہ ہے جو اپنے عمل سے ظاہر کرے۔ اچھائی برائی۔ اور وہ ایسا ہے۔" اسے نہایت سکون سے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جمائے اسے سن رہا تھا۔ اس نے دیکھا تھا عبداللہ کے چہرے پر سرخی نمایاں ہو گئی تھی۔ جوش سے وہ ایک ہاتھ کی مٹھی بنا کر دوسرے ہاتھ پر برابر مارتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز بہت تیز ہو گئی تھی۔ یوں جیسے اپنے اندر کی ساری توانائی' جوش باہر انڈیلنا چاہتا ہو۔

"تمہیں پتہ ہے۔" وہ ہلکے تبسم کے ساتھ بولا تھا۔ "وہ ڈاکٹر ہے لیکن دین کے لیے اس نے اپنا سب عیش و آرام چھوڑ دیا ہے آج کل کے دور میں ہے کوئی ایسا؟" وہ اس سے سوال کر رہا تھا۔ اس کے سر نفی میں ہلانے پر وہ بولا تھا۔

"ہاں کوئی نہیں میں بھی ایسا کہتا ہوں۔" عبداللہ جوش سے بولا تھا۔

"آپ نے بھی تو۔ آپ نے اپنی جاب کیوں چھوڑ دی؟" اس نے اب کی بار اسے کریدا تھا۔

"کیونکہ یا تو وہ مجھے نکال دیتے یا پھر میں خود آرام نہ محسوس کرتا۔ اسلام قبول کرتے ہی یہ جاب میں نے

چھوڑ دی۔" اس نے وضاحت کی تھی۔
"آج کل ایک چھوٹی سی شاپ چلا رہا ہوں۔ سچی بات ہے کوئی جاب اگر اچھی آفر ہوئی۔ تو کر لوں گا ورنہ چھوٹی موٹی جاب سے بہتر یہ شاپ ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔
"میں نے آپ کا بہت وقت لیا ہے۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" آجے نے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔
"نہیں کوئی بات نہیں۔" وہ نرمی سے بولا تھا۔
"بلکہ مجھے تو اچھا لگا کہ کسی سے کچھ شیئر کر کے سکون سا محسوس کیا۔" وہ بھی صوفے پر سے اٹھتے ہوئے بولا تھا۔ واپسی پر وہ اس کی باتیں سوچے جا رہا تھا۔
"ہے آج کل کے دور میں کوئی ایسا؟" عبداللہ کی کہی بات اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی۔
"واقعی آپ جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔" گاڑی فل اسپیڈ میں چلاتے ہوئے وہ خود سے بولا تھا۔

digest library.com

☆ ☆ ☆

قرۃ العین اس کی بچپن کی دوست۔ اس نے اسے اس صدمے سے باہر لانے کی خاصی کوشش کی تھی۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ واپس آنے والا نہیں۔ زندگی سے خفا بیٹھی تھی۔ قرۃ العین اور اس کی فیملی سے اچھے خاصے تعلقات تھے۔ اسے زندگی کی طرف لانے میں تھوڑا بہت قرۃ العین کا ہاتھ تھا۔ وہ دوبارہ سے اس کارشتہ زندگی سے جوڑ گئی تھی۔ اس کی یہ کایا پلٹ اسی کی بدولت ہی تھی۔ وہ ہی ایسے حالات میں اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر چلی تھی۔ اس کا سہارا بنی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج باربرا کے ساتھ وہ ڈسٹرائٹ کی قدرے معروف مارکیٹ میں کچھ خریداری کے سلسلے میں آیا تھا۔ وہ دونوں اپنی پسند کی چیزیں دیکھ رہے تھے۔ اسے کچھ شیو کا سامان اور کپڑے خریدنے تھے۔ پرفیوم ہاتھ میں پکڑے اس پر لکھی عبارت کو پڑھ ہی رہا تھا جب اس کی نظریں بے ساختہ گلاس ڈور سے اندر آتی اس پر پڑی تھیں۔ سب کچھ بھلائے وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں بھی سکندر پر پڑ چکی تھیں۔ لیکن پھر یکدم اپنی نظریں ہٹا کر اس کے پاس سے گزرتی چلی گئی تھی۔ اس کے گزرتے ہی اس نے ایک گہری سانس اپنے اندر اتاری تھی یوں جیسے اس کے وجود کی خوشبو اپنے اندر اتارنا چاہتا ہو۔ پھر خریداری میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ اب اس کے حواس پر صرف ایک بات ہی سوار تھی کہ وہ یہیں اس کے قریب موجود ہے۔ باربرا اپنی خریداری کر کے اس کے پاس آ گئی تھی۔
"چلو۔" وہ بولی تھی۔
"ہوں۔" وہ مدہوشی کی کیفیت میں تھا۔
"ہاں... نہیں فی الحال تو میں نے کچھ خریدا ہی نہیں۔"
"کوئی بات نہیں میں انتظار کر لیتی ہوں۔" وہ خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے بولی تھی۔
اس نے دیکھا تھا۔ سوئیٹر ہاتھ میں لیے اس کی نظریں چند سیکنڈز کے لیے ان دونوں پر پڑی تھیں۔ پھر سکندر کی نظریں اپنے چہرے پر جمے دیکھ کر یکلخت اس نے اپنا چہرہ جھکا لیا تھا۔
"باربرا پلیز تم اب جاؤ۔ میں خریداری کر کے آ جاؤں گا۔" وہ اسے یہاں سے بھگانا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے باربرا کے ساتھ مزید دیکھے۔ اپنی یہ کیفیت خود اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے سکندر کی گرل فرینڈ سمجھے۔ اور نہ ہی باربرا کے لیے خود اس نے اس لفظ کا کبھی استعمال کیا تھا۔ ابتدا میں تو وہ اسے نظرانداز کرتا رہا تھا۔ لیکن باربرا کی پرخلوص دوستی کے آگے اس نے ہار مان لی تھی۔ اب وہ اس کی صرف دوست ہی تھی نہایت پرخلوص اور بس۔ باربرا اس کی اس حرکت پر حیران و پریشان کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد نہ سمجھ میں آنے کے باوجود وہ بولی تھی۔
"ٹھیک ہے لیکن آج شام سات بجے کا ٹائم نہیں بھولنا۔" اسے تنبیہہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ باربرا

کے جانے کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ پھر بظاہر چیزوں کو جانچتے ہوئے اس کا ذہن اسی کو سوچے جا رہا تھا۔ پھر جانے دل میں کیا سمائی۔ اس کے قدم اس کی سمت اٹھنے لگے تھے۔ اس کے قریب جا کر وہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی طرف پشت ہونے کے باوجود وہ اس کی موجودگی محسوس کر رہی تھی۔ لیکن بنا کوئی تاثر ظاہر کیے وہ بدستور چیزوں کی چیکنگ میں لگی رہی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" اس کی آواز اب وہ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں بھی پہچان سکتی تھی۔ اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

"میں آپ سے بات کر رہا ہوں؟" اب کی بار آواز میں سختی تھی۔ وہ کچھ بھی نہ کہنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

"آپ سے بات کر رہا ہوں میں۔" اب کی بار اس نے تقریباً" چیختے ہوئے کہا تھا۔ وہاں موجود لوگوں کی اکثریت ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ لوگوں کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اچانک اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ وہ جلد سے جلد اس مارکیٹ سے' اس علاقے سے دور جانا چاہتی تھی۔ جہاں وہ اس کی آواز کو نہ سن سکے۔ اس کے بڑھتے قدم دیکھ کر وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ اسے اپنے پیچھے آتے اور اپنے برابر دیکھ کر اس نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی تھی۔ دفعتاً" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ کر اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ دو تین سیکنڈ تک گہری سانس لینے کے بعد اس نے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ اگلے ہی پل وہ اسے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے تیز تیز چلتا ہوا کھینچ کے لے جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے بیچ بازار وہ ننگے سر پھر رہی ہو۔ گارڈ سے اس نے کچھ کہا تھا۔ ہاں اس کے کانوں میں یہ جملہ گونج رہا تھا۔

"شی از مائی وائف۔" اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے جسم میں اتنی ہمت و توانائی نہ تھی کہ وہ یہ کر سکتی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن میں چلتا خون منجمد ہو گیا ہو۔ جما ہوا' رکا ہوا۔ اس کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔ پھر اس نے اسے گاڑی کی سیٹ میں بٹھاتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ بار بار اس پر نگاہ ڈالنا نہ بھول رہا تھا۔ آخری چیز جو اس کی یادداشت میں رہ گئی تھی۔ وہ اس کے آنسوؤں کا چہرے پر بارش کے پانی کی صورت بہنا تھا۔

☆ ☆ ☆

آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے اس نے اپنے سر میں شدید درد محسوس کیا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ اسی طرح چت لیٹے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ لیکن ذہن بدستور سن سا تھا۔ کھلی آنکھیں چھت پر جمائے وہ ذہن پر زور دیتی رہی تھی۔ پھر اس کی نظریں گلاس ونڈو اور پھر اس سے آگے وارڈ روب' دیوار کی پینٹ' کمرے میں موجود کمپیوٹر' سامنے دھرا صوفہ بائیں سائیڈ میں پڑے ڈریسنگ ٹیبل سے ہوتے ہوئے کمبل پر جا پڑیں۔

"کس کا ہے یہ؟" پھر کچھ یاد آتے ہی یکدم وہ بیڈ سے اتر گئی تھی۔ خود پر نگاہ گئی' اس کے بدن پر بدستور حجاب موجود تھا۔ وہ بیڈ روم سے نکل آئی تھی۔ جوں ہی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ سامنے صوفے پر ٹانگیں پھیلائے وہ بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ جلدی سے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے آثار تھے۔ جنہیں وہ نظر انداز کر کے بولی تھی۔

"تم نے جو میرے ساتھ کیا' میں اسے کبھی بھول نہیں سکتی۔" وہ اسے اپنے قریب آتے دیکھ کر قدرے پیچھے ہٹ کر بولی تھی۔

"مجھے جانا ہے۔ میں۔۔۔ میں تمام عمر تمہاری اس بدتمیزی کو نہیں بھولوں گی۔ تم جو بھی ہو۔ میں تمہیں بد دعا دوں گی جتنا پریشان تم نے مجھے کیا ہے۔ اللہ کرے تمہیں اس کی بری سزا ملے۔" اس کے خاموش کھڑے ہو کر سر جھکانے پر وہ مزید بولی تھی۔

"اللہ کرے تمہیں اتنے دکھ ملیں۔ جتنا تم دوسروں کو دیتے ہو۔" وہ سسک سسک کر رونے لگی تھی۔ اس

کی آواز اس کے کرب و سوز کی انتہائی کیفیت بیان کر رہی تھی۔ اس کے خاموش ہونے پر وہ بولا تھا۔

"اگر کچھ اور کہنا ہو تو وہ بھی کہہ دو۔" اس کی آواز دھیمی اور سر جھکا ہوا نظریں زمین پر کچھ ڈھونڈتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"ہاں کہوں گی۔" وہ چیخی تھی۔ "اس سب کا کیا مطلب ہے؟ کیوں تم میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ یہاں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔"

"مجھے ان لڑکیوں سے کوئی سروکار نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا تھا۔ لیکن اس کا لہجہ نرم ہی تھا۔

"تمہیں سروکار نہیں ہے تمہیں۔۔۔ تو ابھی تم اس لڑکی کے ساتھ کیا کر رہے تھے؟ کون تھی وہ تمہاری کیا تھی وہ؟" وہ چلا چلا کر پوچھنے لگی تھی۔ "تمہیں سروکار ہے ان سے لیکن تمہیں عادت پڑ چکی ہے ہر عورت پر اپنا جال پھینکنے کی۔" غصے سے اس کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔

"پلیز ایسا مت کہو۔" اس کی آواز میں التجا تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا تھا۔

"پلیز بات سنو میری۔" اس کی آواز میں نمی گھل گئی تھی۔

"اتنے عرصے سے میں تم سے بات کرنا چاہ رہا ہوں لیکن تم سننے پر آمادہ نہیں ہو۔ کیا کرتا میں بولو۔ تم نہیں بیٹھ کر میری بات سننے کی روادار نہ تھیں۔ ایسے میں مجھے یہی سوجھا۔ مجھے پتہ ہے میں بہت غلط کر چکا ہوں لیکن پلیز تم مجھے معاف کر دو۔ مجھے بددعا مت دو میں نے جو یہ غلط حرکت کی ہے تو بہت مجبور ہو کر۔ صرف ایک بار اگر تم میری بات سن لیتیں تو تمہارا کیا بگڑتا۔ ہر کوئی غلط نہیں ہوتا۔ میں غلط نہیں ہوں۔ میرا یقین کرو۔ اگر مجھے جوانی میں موت آئے تو سب سے زیادہ تم ہی روؤ گی۔"

اس کی بات پر وہ دم بخود ہو گئی تھی۔ اسے اپنے الفاظ کی سفاکی کا علم ہو گیا تھا۔ اس کے بڑھتے قدم دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کر بولا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس کے پلٹ کر غصے سے دیکھنے پر وہ بولا تھا۔

"آج بھی تم نے میری بات نہیں سنی۔ بلیو می میں تم سے یہی کہنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔" وہ اس کی بات سنے بغیر وہاں سے نکل آئی تھی۔ نانا جان کو اس نے سارا واقعہ بتا دیا تھا لیکن تھوڑی سی ترمیم کر کے وہ نہیں چاہتی تھی کہ خوامخواہ فضول سی بات مذاق میں بھی پھیلے۔ نانا کو وہ یہی بتا پائی تھی کہ اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی پھر اتفاق سے وہاں سکندر ملا تھا۔ اس لیے وہ اسے وہاں ہی لے گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن وہ یہ اندازہ اچھی طرح لگا چکی تھی کہ نانا جان اس کی بات پر سو فیصد ایمان لے آئے تھے۔ سکندر کی بدتمیزی نے اسے قدرے محتاط کر دیا تھا۔ اس نے مزید بہتری اس میں جانی کہ اسے اس قسم کا موقع ہی نہ دے کہ جہاں ان کی ملاقات ایک منٹ سے زیادہ ہو۔ آج کل اس کے ذہن پر سکندر کی عجیب حرکتیں ہی سوار تھیں۔ وہ اس کی آئے دن کی ان حرکتوں سے سخت نالاں تھی۔

digest library.com

عبداللہ سے وہ ملنے لگا تھا۔ اس سے اب کی ملاقاتیں کئی مرتبہ ہو چکی تھیں۔

"سکون کہیں نہیں ملا مجھے۔ میں چرچ میں بھی گیا۔ میری ماں عیسائی تھی میں سمجھتا تھا کہ اگر مجھے سکون حاصل کرنا ہو تو یہاں بھی جاتا رہوں۔ لیکن بے سود۔" گردن دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ "میں مندر بھی گیا۔ میں ہندو ہوں کیونکہ میرا باپ ہندو تھا۔ لیکن وہاں مجھے وہ نہ ملا جس کی مجھے تلاش ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا وجود بالکل خالی ہو۔ میرا دل نہیں ٹھہر رہا۔ مجھے وہ سکون چاہیے۔ جس سے کہ میرا دل ٹھہر جائے کسی ایک جگہ کسی ایک مقام پر۔" وہ ایک جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"سکون ہی سکون ہے ہر طرف۔ بس بات ہے نظر ڈالنے کی جان لینے کی سمجھنے کی۔"

عبداللہ کی گمبھیر آواز کمرے کے سکوت کو توڑ گئی۔

تھی۔

''مذہب ہی سکون ہے۔ تم کہتے ہو نا کہ میرے چہرے پر بکھرے سکون نے تمہیں میرے پیچھے آنے اور اسلام قبول کرنے کی وجہ بتانے پر اکسایا۔ مذہب ہی ہے جو سکون دیتا ہے۔ ایک ایسا راستہ ہے۔ جو بالکل واضح اور بالکل سیدھا ہے۔ دین اسلام بالکل سیدھا، سچا راستہ، کوئی ایکسیڈنٹ نہیں۔ کوئی کانٹا نہیں۔ کوئی تکلیف نہیں سیدھی سڑک چھوڑ کر کانٹوں میں الجھو گے۔ تو جسم کو بے چینی تو ہوگی ہی کہ کانٹے جسم کو بے چین کر دیتے ہیں۔ ان پر چل چل کر انسان تھک جاتا ہے اور پھر ہار مان کر وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ اصل مسئلہ تو تب ہے۔ جب وہ وہیں بیٹھا رہے۔ اگر وہ اٹھا اپنے آپ کو جھاڑا اور سیدھی سڑک پر نکل آیا۔ تو ٹھیک ورنہ تو ہمیشہ کے لیے ہی بے سکون ہے۔''

اس کے خاموش ہوتے ہی اجے بولا تھا۔ ''مذہب کی ضرورت میرا نہیں خیال کہ مذہب۔'' پھر وہ بات کو بدل کر بولا تھا۔ ''مذہب سے کچھ نہیں۔ ہر مذہب بہتر بیلیوز بتاتا ہے اور پھر میرے خیال سے ہر مذہب اپنی جگہ صحیح ہے۔ جو جیسا ہے ٹھیک ہے۔'' اجے نے دیکھا تھا وہ ہنس رہا تھا۔ پھر بولا تھا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

میرا مطلب ہے کہ مذہب کی اتنی ضرورت بھی نہیں۔'' اجے نے کچھ الجھے ہوئے انداز میں اس سے کہا تھا۔

''ہاں مذہب کی ضرورت نہیں، تبھی تو دنیا میں امن پھیل رہا ہے۔ امن کے جھوٹے نعرے لگانے والے۔ دل میں کچھ زبان پر کچھ۔'' وہ تلخی سے بولا تھا۔ اسلام امن کا دین ہے۔ صرف زبانی نعروں کے ساتھ نہیں امن کی تلقین کرتا۔ بلکہ عملاً'' اس کا نفاذ بھی کرتا ہے اب تک۔ کہاں ہے دنیا بھر میں مسلمان جنہوں نے ساری دنیا کو اپنے سر پر اٹھایا ہو۔ جہاں انہوں نے فساد پھیلا کر خون کے خون بہائے ہوں۔ اگرچہ آج کے مسلمان عملاً'' وہ نہیں جو پہلے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اب بھی ان کے اندر اتنا خوف خدا ہے کہ وہ جابر سے جابر ہوتے ہوئے بھی ملک تہس نہس نہیں کر سکتے۔ آج کے اس گئے گزرے دور میں بھی۔'' وہ پر جوش ہو گیا تھا۔

''مذہب کی ضرورت ہے اس دنیا میں فساد ختم کرنے کے لیے اور فساد تب ہی ختم ہو سکتے ہیں جب لوگوں کے اندر خوف خدا ہو اور خوف خدا صرف اور صرف مسلمان کے اندر ہوتا ہے۔ خوف خدا ایمان سے آتا ہے۔ یہ یقین کہ ہاں ہمیں اپنے اعمال کا جواب دینا ہوگا۔ یہی بات ہمارے اندر خوف خدا پیدا کرتی ہے۔ کیا ہے یہاں؟ صرف Duty فرض'' ہونہہ وہ استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا تھا۔

''اسلام واحد مذہب ہے جو زکوٰۃ ایک مسلمان پر فرض کرتا ہے۔ کس لیے اکنامک ایکولیٹی کے لیے۔ امیر سے لے کر غریب کو دینا۔ اور یہاں ایک شوہر اپنی بیوی کا بل نہیں دیتا۔ اس کی بیوی خود پے کرے گی۔ بیوی کی بے منٹ اس پر فرض نہیں۔ جہاں بیوی کی پے منٹ فرض نہیں وہاں کسی دوسرے بندے کی مالی مدد کس کھاتے میں ہوگی۔ جہاں ماں باپ اولڈ ہومز میں اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ پھر ان کی اولاد کی بڑھاپے تک کی بے چینی، بے سکونی کہ آیا اب مجھے اولڈ ہوم میں لے جایا گیا کہ اب۔ یہ ہیں فرائض جہاں دس ڈالر کے لیے خون بہائے جاتے ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب کہ جہاں غریبوں کے حقوق کا اس قدر خیال رکھا جاتا ہے کہ زکواۃ کے لیے جہاد کو فرض کر دیتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہوا ہے۔ کیا نہیں ہے ضرورت؟'' اب کے وہ دھیمے لہجے میں سوالیہ انداز میں پوچھنے لگا تھا۔ پھر خود ہی بولا تھا۔

''ضرورت ہے اس دین کی جہاں مومن میدان جنگ میں کود پڑتا ہے۔ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر۔ فرض سمجھ کے نہیں ایمان سمجھ کے، فرائض خود کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اپنی Duty مرضی آئی کر لی ورنہ تو نہیں۔'' ٹیبل پر ـــــ جوش سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا تھا۔ ''ایمان سمجھ کے لڑتا ہے مومن۔'' پھر

قدرے ریلیکس ہو کر وہ صوفے کی پشت پر سر رکھتے ہوئے بولا تھا۔

"وہی ہے معبود۔ جو اس زمین پر رینگنے والے چھوٹے سے چھوٹے کیڑے چیونٹی کو رزق پہنچانے والا ہے۔ وہ جو ہماری ناشکری' ہماری نافرمانی کے باوجود ہمیں نوازتا ہے اگر یہ خدائی ہمارے ہاتھ میں ہوتی اور اسی طرح ہم کسی کو دیتے اور وہ ہماری ناشکری کرتا تو دوسرے ہی دن ہم یہ کہہ کر دینے سے انکار کر دیتے کہ یہ بندہ بڑا ناشکرا ہے۔ ہمیں دیکھو۔ باوجود ناشکری کے' باوجود ہماری نافرمانی کے وہ ہمیں دے رہا ہے———— کوئی بت نہیں۔ کوئی شریک نہیں اس کا وہی ہے جو ذات پاک ہے۔ زمین کے ذرے سے لے کر آسمان تک ہر چیز' کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ زمین پر موجود ہر ٹکڑا' آسمان پر قائم ستارے' سیارے جہاں توازن کی چاروں طرف صدائیں گونجتی ہیں۔۔ کسی جامد ساکت وجود کے بس کی بات نہیں۔ جو خود کو سہارا نہ دے سکے۔ جو اپنا وجود قائم نہ رکھ سکے۔ وہ کسی کو کیا دے سکتا ہے۔" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"بہت ضرورت ہے دین کی۔ اس دین کی جسے دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ وہ پیغمبر جو تن تنہا اس دین کی تبلیغ کر کے اسے کرہ ارض پر پھیلا دیتا ہے۔ اس دنیا کی آزمائش سے لڑنا اور خود کو ثابت قدم رکھنا ہی ایمان ہے۔ نہ کہ جنگلوں میں بسیرا کر کے خود کو صحراؤں کی خاک چھاننے تک محدود کرنا' الگ تھلگ بیٹھ جانا' دین کی اہمیت ہے۔ اکمل ذات ہے اس پیغمبر کی کہ جس نے اس پہلو کو روشن کیا۔ جس میں ہماری فلاح ہے۔ حکمت کے وہ دیے روشن کیے کہ جسے دنیا کے بڑے بڑے دانشور غیر مسلم تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس دنیا کو تباہی سے ایک ہی چیز بچا سکتی ہے۔ اسلام۔" ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا تھا۔

"امن ہے سکون ہے' ایمان ہے' نجات ہے' وہ ذات باری تعالیٰ جو کہتا ہے' آؤ نجات پانے کے لیے جس نے نجات پائی وہ جنت پا گیا اور جس نے بچاؤ کی راہ اختیار نہ کی۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔"

"آج۔" چند لمحے بعد وہ بولا تھا۔ "میں قسم کھاتا ہوں۔ تبدیلی آ سکتی ہے۔ سب کچھ بدل سکتا ہے۔ ایمان کے آنے سے کوئی کسی پر سپر پاور نہ رہے گا سوائے اس معبود حقیقی کے۔ جو سارے جہانوں کا مالک و پروردگار ہے۔" وہ دم بخود سا ہو کر سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خاموش جامد تاثرات کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شمالی ریاست مشی گن جہاں نومبر کے مہینے سے ہی برف باری شروع ہو جاتی ہے۔ دسمبر جنوری تک تو گھروں سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ عمارتوں کے سامنے کئی فٹ پڑی برف آنے جانے میں بڑی تکلیف کا باعث بنتی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو گاڑی کو نکالنے اور اس کے لیے راہ بنانے کا ہوتا ہے۔

اس وقت وہ واک کرنے کے موڈ میں تھا۔ اس لیے وہ گاڑی نکالے بغیر پیدل ہی چل پڑا تھا۔ لیکن اب وہ چلتے چلتے اچھی خاصی سردی محسوس کرنے لگا تھا۔ برف باری جاری تھی۔ وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اگرچہ دستانے پہنے ہوئے تھا۔ شفاف سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ مین روڈ سے ٹرن لیتے ہوئے وہ ذیلی سڑک پر آیا تھا۔ اس سڑک کے دائیں جانب چرچ تھا۔ چرچ تک اینٹوں کی روش تھی۔ سڑک سے چرچ تک کا فاصلہ تقریباً" پچاس فٹ کا تھا۔ یہ چرچ اس کے اپنے اندازے کے مطابق کافی پرانا تھا۔

وہ چرچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔ اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے اس نے کچھ حرارت دی تھی۔ لیکن سردی کسی طرح کم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ باوجود سردی کے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لیے تھے اور اس میں برف پکڑنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ جانے کتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا تھا۔ ساتھ ہی آتے جاتے گزرتے لوگوں کی

digest library.com

ہوں میں امڈتی حیرت اسے لطف دے رہی تھی۔
پر عبداللہ کی پھسلتی گاڑی چرچ کو دس پندرہ قدم چھوڑ گئی تھی۔ لیکن پھر ریورس ہو کر چرچ کے سامنے سڑک پر رک گئی تھی۔

"اے جے۔" وہ چلایا تھا۔ وہ کسی خیالوں میں کھویا اپنے پر چونک گیا تھا۔ پھر اٹھتا ہوا اس کی طرف تیز قدموں سے بڑھا تھا۔ قریب جا کر اس نے گاڑی کے دوسرے سائیڈ کے دروازے پر ہاتھ رکھ دیے تھے اور جھکا کر اس سے بولا تھا۔

"کہیں جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"پر تم کیا کر رہے ہو یہاں؟"

"کچھ نہیں بس واک کرتے ہوئے یہاں نکل آیا"

"آؤ میں ڈراپ کر دوں تمہیں۔" گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

وہ بیٹھ گیا تھا۔ "تم کہاں جا رہے تھے؟" ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"میں۔۔۔" وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

"میں اسلامک سینٹر جا رہا تھا۔" "کوئی کام ہے؟" اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

"کیا کام ہے؟" وہ اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

"آج ڈاکٹر صاحب کا واعظ ہے میرا مطلب ہے ہے۔ وہ کافی عرصے بعد یہاں آئے ہیں۔ تین دن ان کے میں وہیں جا رہا تھا۔" وہ خاموش ہو گیا تھا۔

"راستے میں پڑتا ہے اسلامک سینٹر؟" اس کی آواز ہلکی تھی۔

"نہیں وہ پیچھے رہ گیا ہے تمہیں ڈراپ کرنے کے بعد وہاں جاؤں گا۔" عبداللہ نے موڑ مڑتے ہوئے کہا تھا۔

"گاڑی موڑ لو۔ میں بھی وہیں جاؤں گا۔" اس کی بات تھی۔ عبداللہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گاڑی موڑ لی تھی۔

"اس جہاں میں کوئی چیز نہ خود بنتی ہے نہ ٹوٹتی ہے بلندی اور پستی بقا اور فنا، وجود اور عدم، اس سب کے پیچھے ایک ہستی ہے جسے بقا حاصل ہے۔ فنا سے پاک ہے۔ جسے ثبات حاصل ہے۔ جو تبدیلی اور تغیر سے پاک ہے۔ جہاں نہ آنکھ پہنچ سکتی ہے نہ خیال سارے جہاں کے تعریف کرنے والے اپنی طاقت دکھا دیں۔ تو بھی اس کی تعریف نہیں کر سکتے۔ اس ذات پاک جس نے ہم سب کو وجود بخشا۔ ایک دن وہ ہمیں موت بھی دے گا۔ معمولی غلطی پر مارنے والے، ایک دوسرے کا خون بہانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک دن موت ان کو بھی اپنی گرفت میں لے گی۔ ہم بھاگ نہیں سکتے۔ ہم چھپ نہیں سکتے۔ جتنا چاہے چھپ جائیں جتنا چاہیں بھاگیں۔ کتنا بھاگیں گے۔ یہ موت ہمیں ایک نہ ایک دن ضرور پکڑے گی۔ پتھر کے برج بنانے والے، بڑی بڑی حفاظتی دیواریں بنانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ موت ان کو آن دبوچ لے گی۔ کوئی بچاؤ نہیں کوئی راستہ نہیں۔ اگر موت سے کوئی بچ سکتا تو اللہ کا نبی بچتا۔ اللہ اپنی طاقت میں بے مثال ذات۔ کامل اکمل ذات، اسی کو علم ہے وہی جانتا ہے۔ کتنے لوگ مر چکے، کتنے زندہ ہیں۔ انسانوں کو چھوڑو۔ کتنے جانور مر گئے۔ کتنی چیونٹیاں مر گئیں۔ ان سب کا علم رکھنے والا ہے۔ ماضی میں جو کچھ ہوا۔ وہ اس کے سامنے، جو زندہ ہیں وہ اس کے سامنے جو مر رہے ہیں وہ اللہ کے سامنے۔ دنیا میں اس وقت جو ہو رہا ہے۔ وہ اس کے سامنے۔

اللہ کا کارخانہ ایک سیکنڈ میں ایک وقت میں کتنی چیزیں بنا رہا ہے اور کہیں بھی غلطی نہیں ہوتی۔ مچھر کے انڈے سے مچھر نکلے گا۔ مچھلی کے انڈے سے مچھلی۔ آم ہمیشہ آم رہے گا۔ ناشپاتی ہمیشہ ناشپاتی رہے گی۔ اللہ کی ذات غلطی سے پاک ہے۔ غفلت سے پاک ہے۔ بھول سے پاک ہے۔ وہ کسی چیز سے غافل نہیں۔ اونگھنے سے پاک ہے۔ عاجزی سے پاک ہے۔

تھکنے سے پاک ہے۔ ماں کے پیٹ میں اندھیرے میں کیا بنانا ہے وہ غافل نہیں۔ انڈے میں کیا کیا بنانا ہے غافل نہیں۔ وہ کسی کا محتاج نہیں کوئی اس پر غالب نہیں وہ سب پر غالب ہے کوئی اسے نقصان پہنچانے والا نہیں۔ کوئی اسے نفع نہیں پہنچاتا۔ کوئی اس سے پہلے نہیں ہے۔ کوئی اس کے بعد نہیں ہے۔

ساری دنیا کے سمندروں کو جمع کرو۔ ان کی سیاہی بناؤ پھر سارے درختوں کو جمع کر کے قلم بناؤ۔ یہاں تک کہ سیاہی خشک ہو جائے۔ قلم ٹوٹ جائیں' لیکن تیری تعریف ختم نہ ہو سکے۔ چاہے اور اتنے سمندر لے آؤ اے اللہ ہم تیری تعریف نہیں کر سکتے۔ ہم عاجز ہیں۔ ہم ایمان لائے تجھ پر تو ہی عزت دینے والا ہے تو ہی ذلت دینے والا ہے۔ افضل ہے تیری ذات۔ بلند و برتر ہے تیری ذات تو جو چاہے وہ ہو جائے اور جو نہ چاہے وہ ہو نہیں سکتا۔

اے اللہ تو بڑا کریم ہے تو بڑا رحیم ہے۔ اے پروردگار تو ہم پر رحم فرما۔ اے اللہ تو ہمیں ایمان نصیب کر۔ اے اللہ تو ہمیں ایمان نصیب کر۔ اے اللہ تو ہمیں ایمان نصیب کر۔"

ڈاکٹر صاحب نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جو اس کے دل و دماغ پر نقش ہو گیا تھا۔

جب سے وہ اسلامک سینٹر سے آیا تھا۔ اس کے کانوں میں ڈاکٹر صاحب کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اس درس کو سننے کے بعد وہ بہت بے چین و مضطرب تھا۔ ہر وقت اس کے دل پر ایک بوجھ سا طاری رہنے لگا تھا۔ وہ بہت تکلیف میں تھا۔ وہ ڈر گیا تھا۔

"معمولی غلطی پر مارنے والے' ایک دوسرے کا خون بہانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک دن موت ان کو بھی اپنی گرفت میں لے گی۔" اسے موت سے ڈر لگنے لگا تھا۔ موت کے بعد کیا ہو گا؟ وہ ڈر گیا تھا۔ اس ڈر نے اس کے اندر دراڑ ڈال دی تھی۔ اور یہ دراڑ آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھی۔ "ہاں سچ ہے۔ وہ جو چاہے کر دیتا ہے۔ وہ بہت مہربان نہایت رحم والا ہے۔"

برف کے ذرات اس کے چہرے اور جسم پر گر رہے تھے۔ لیکن وہ بے پرواہ بے نیاز بیٹھا انہی باتوں کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے جسم کی تپش سے برف کے ذرے پگھل رہے تھے۔ اس وقت اس قدر سردی کے باوجود اسے سردی نہیں لگ رہی تھی۔ یا شاید اس کی محسوس کرنے کی حس ہی ختم ہو گئی تھی۔ ایک خشک پتہ اس کے چہرے سے ٹکرا لیا تھا۔ وہ چونک گیا تھا۔ پتہ ہاتھ میں لیے وہ اس کی تخلیق اور خالق کو سوچنے لگا تھا۔

"کیا یہ پتہ میں بنا سکتا ہوں؟"

"نہیں۔" خود کو جواب دیتے ہوئے وہ بولا تھا۔ "کیا ایک مٹی کا پتلا اسے بنا سکتا ہے؟"

"نہیں۔" وہ خود سے سوال جواب کرنے لگا تھا۔

"تو پھر کہاں ہے غلطی؟" وہاں بیٹھا اس غلطی کو ڈھونڈنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ کب سے بستر پر پڑا تھا۔ وہ اپنے گرد موجود اس خاموشی کو محسوس کر رہا تھا۔ جو آج اسے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ بادلوں کے گرجنے کی آواز' اس کے اندر خوف و خاموشی کو مزید ہوا دے رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے اس روکھے پھیکے انداز سے' اپنی بے وجہ کی زندگی سے اکتا گیا تھا۔ بستر چھوڑتے ہوئے وہ واش روم چلا گیا تھا۔ نہانے کے بعد وہ تیار ہوا تھا۔ گرم جیکٹ اور دستانے پہننے کے بعد اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی تھی۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر کے وہ اپنی گاڑی کی طرف آیا تھا۔

عبداللہ سے ملے ہوئے ان کی آپس میں لا ہوئے آٹھ نو ماہ ہو چکے تھے۔ ان دوران وہ ہر موضوع پر بولتے رہے تھے۔ اپنی ذات سے لے کر اجتماعی ر موضوعات تک۔ ڈرائیو کے دوران وہ عبداللہ کی ایک بات سوچ رہا تھا۔

"رونگٹے کھڑے ہونا کیا ہوا ہے یہ ان کی باتیں

ر معلوم ہوا۔"

"ہاں۔" ایک گہری سانس اس کے منہ سے خارج ہوئی تھی۔

"وہ جو خالق کائنات ہے۔ معبود حقیقی ہے۔ وہ جو مشاورت سے پاک ہے۔ وہ جو غفلت سے پاک ہے۔ وہی ہے اور کوئی نہیں۔ اس کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ چند روزہ زندگی اور پھر مستقل زندگی۔ دو روز کا بس نہیں۔ مرنے کے بعد کا سکھ سوچو۔ مرنے کے بعد کا سوچو۔" کوئی اس کے اندر ہی اندر ضرب لگا رہا تھا۔ چٹان چیخ کر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہونے لگی تھی لاوا پھٹ رہا تھا۔ اس کی لپیٹ میں سارا جسم آنے لگا تھا۔ بچاؤ کا ایک ہی راستہ تھا۔

عبداللہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بالکل گم صم ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر ہی پہلے ڈور بیل کی اطلاعی آواز کے ساتھ ہی اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اسے کو اتنی صبح دیکھ کر وہ بہت حیران ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ جو رتجگے کا واضح اعلان کر رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر الجھن کے بجائے پر سکون قسم کے تاثرات تھے۔ عبداللہ کو کچھ بھی کہے بغیر وہ اس کے ایک طرف ہوتے ہی اندر چلا آیا تھا۔ عبداللہ حیرت میں گھرا دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے چل دیا تھا۔

"کہاں بیٹھیں۔" استفسار طلب لہجے میں اس نے کہا تھا۔

"یہیں بیٹھ جاؤ۔" عبداللہ نے کہا تھا۔

"نہیں میرا خیال ہے کہ ہمیں اندر کمرے میں جانا چاہیے۔ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"او۔" حیرت میں چھپے تاثرات نہ چاہتے ہوئے بھی عبداللہ کے چہرے پر واضح نظر آ رہے تھے۔ "کیا بات ہے اسے" وہ دونوں بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

"کیا بات ہے۔" عبداللہ نے پوچھا تھا۔ اور وہ بات ر عبداللہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھ گیا تھا۔ اسے

ایک خبطی سی لڑکی کی کہانی

وہ خبطی سی دیوانی سی

آسیہ سلیم قریشی کا ایک ایسا ناول جو خواتین ڈائجسٹ میں قسط وار چھپا اور بے حد مقبول ہوا، آج بھی ہر لڑکی، ہر خاتون یہ ناول پڑھنا چاہتی ہے

اب کتابی صورت میں چھپ کر تیار ہے

مجلد، خوبصورت سرورق، قیمت 400 روپے

خواتین ڈائجسٹ

اردو بازار کراچی

ملنے کا پتا

• مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی

• لاہور اکیڈمی، 205 سرکلر روڈ بیرون اردو بازار، لاہور

digest library.com

یقین نہیں آرہا تھا۔
"کیا صحیح سنا ہے میں نے؟" وہ خود سے بولا تھا۔
"کیا کہا تم نے؟" وہ دونوں آمنے سامنے بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔
"میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔" آہستگی سے کہتے ہوئے وہ بولا تھا۔
"الحمد اللہ۔" عبداللہ کے منہ سے جوش سے یہی نکلا تھا۔ پھر اس نے اجے کو گلے لگالیا تھا۔
"مجھے یقین نہیں آرہا۔" عبداللہ ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔
"بس بہت سوچنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔" وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولا تھا۔
"یہی سچ ہے۔ یہی حقیقت ہے۔ میں جان چکا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے درس نے میرے اندر دراڑیں ڈال دی تھیں۔ لیکن آخری فیصلہ میں نے خواب دیکھنے کے بعد ہی کیا ہے۔" اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ وہ بمشکل عبداللہ کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔
"کیسا خواب؟" عبداللہ حیرت انگیز لہجے میں بولا تھا۔
"یہ خواب آج سے پہلے میں دو تین مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ لیکن کل رات اس خواب کو دوبارہ دیکھنے کے بعد میں نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔
"پہلی مرتبہ کب دیکھا تھا؟" عبداللہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا تھا۔
"یہ خواب آج سے تقریباً" پانچ چھ سال پہلے بھی میں دیکھ چکا تھا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہنے لگا تھا۔
"ہندو مسلم فسادات نے ایک قیامت مچا رکھی ہے۔ ہر طرف عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں اور پھر میں نے ہندوں کو امرتسر کے ایک چھوٹے سے محلے میں مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی مسجد کو شہید کرتے دیکھا۔ مسلمان ان کو روک رہے تھے۔ جبکہ وہ خونخوار آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر مسجد کی اینٹیں اکھاڑنی شروع کیں اور اس کے بعد سارے ہندو ٹوٹ پڑے تھے۔ پہلے آدمی نے جیسے ہی عمارت کی کچھ اینٹیں اکھاڑیں تب میں پورے حلق کے بل چیخا تھا۔ لیکن وہاں موجود کسی بھی ہندو نے اس چیخ کو سننے کی ضرورت نہ سمجھی۔ میں چیخ چیخ کر انہیں منع کر رہا تھا۔ پھر میں رونے لگا تھا۔ بے تحاشا میں رو رہا تھا۔ میری زبان پر یہی الفاظ تھے کہ مت کرو۔ مت کرو ایسا لیکن میرے جسم کی ساری توانائی اس لمحے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر میں نیچے ڈھے گیا تھا۔ میرے اوپر سے گزرتے وجود نفرت بھری نگاہ سے آگے بڑھتے ہوئے میرے وجود کو کچل رہے تھے۔ میری چیخیں کسی نے نہیں سنیں۔ کسی نے بھی نہیں اور میرا دل میرے جسم کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔ میری آنکھوں سے سچ مچ آنسو بہہ رہے تھے جیسا میں نیند سے بیدار ہوا تو میں نے دیکھا تھا۔ میں پسینے میں نہایا ہوا تھا۔" اس کی دھیمی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔
"کیا ایسا واقعہ کبھی تم نے دیکھا ہے؟" عبداللہ ٹھنڈے لہجے میں بولا تھا۔
"ہاں۔" اس کے چہرے پر پھیلے اضطراب میں اضافہ ہوا تھا۔
"میرے ساتھ ایسا واقعہ ہوا ہے۔ دیکھا ہوا ہے میرا ایسا واقعہ۔" اس کے الفاظ میں بے ربطگی آگئی تھی۔
"ایک ایسا ہی واقعہ امرتسر کے اس پسماندہ علاقے میں بھی پیش آیا تھا۔" وہ جیسے خلا میں تکتے ہوئے بولا تھا۔
"میں ان دنوں فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اس دن سنڈے تھا۔ صبح ہی سے منوج بھائی کے پاس آدمی آئے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ سب نکل پڑے تھے۔ ان کو دیکھ تو چکا تھا میں۔ پر اسے روز کا معمول سمجھتے ہوئے باہر اپنے دوستوں کے پاس نکل گیا تھا۔ وہاں کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد میں واپس گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ مین روڈ سے گزرتے ہوئے میری نگاہ بلا ارادہ

ہی سڑک جو مین روڈ کے دائیں طرف ہی تھی پر پڑی تھی۔ وہاں مجھے لوگوں کا ایک ہجوم دکھائی دیا تھا۔ کچھ دیر تک تو میں ناسمجھی کے عالم میں دیکھتا اور قیاس کرتا رہا تھا۔ پھر وہاں چیخوں، مار دھاڑ خون میں لت پت لوگوں کو آپس میں گتھم گتھا دیکھتے ہوئے گاڑی سے اتر گیا تھا۔ میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا ان کے قریب۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا بہت سے لڑکے مسجد کی دیواروں پر چڑھے اس کی عمارت کی اینٹوں کو اکھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور پھر میری نگاہوں نے وہاں جو دیکھا تو میں...... میں نے وہاں منوج بھائی کو دیکھا تھا۔ سب سے پہلے اینٹیں انہوں نے اکھاڑیں تھیں۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا، وہاں موجود مسلمانوں کی بے چارگی و بے کسی سے لگائی گئی چیخیں میرے دماغ کی رگیں پھاڑ رہی تھیں میں ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ پھر میں دوڑتا ہوا گاڑی کے پاس پہنچا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے اپنے اوسان بحال کرنے چاہے تھے لیکن سب بے سود۔ بہت تیز ڈرائیو کی تھی میں نے۔ گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے میں بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ رات میں نے کمرے میں ٹہلتے اور سوچتے گزاری تھی۔" وہ رو پڑا تھا۔

"میں خود غرض بن گیا تھا۔ اس لمحے مجھ پر اپنی ذات حاوی ہوئی تھی۔ میں چاہتے ہوئے بھی منوج بھائی سے یہ نہیں پوچھ سکا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ کیا ملا انہیں یہ سب کر کے مجھے ان کے اس فعل سے گھن آئی تھی۔ میرا دل مجھے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ غلط تھا۔ لیکن میں......" اشک اس کے دامن کو بھگونے لگے تھے۔ "میں ان سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ یہ پوچھ نہیں سکا کہ انہوں نے اتنے لوگوں کا خون کیوں بہایا۔ کیا ملا انہیں یہ سب کر کے؟ اس کی سزا مجھے یہ ملی کہ میں اپنے اندر گھٹ کر رہ گیا تھا۔ میری گھٹن بڑھ چکی تھی۔ یہ گھٹن بڑھتی گئی بڑھتی گئی۔ پھر احساس کی صورت میرے دل میں گرہ کر رہ گئی۔ یہ احساس وقت کے ساتھ ہی گھٹتی اور بڑھتی گئی تھی۔

عبداللہ میرا دل اس زندگی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں بے چین ہو گیا تھا۔ ہر وقت میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا۔ میں نے اپنے آرام اور سکون کے لیے ایک آدمی کو اس کے اس قدر برے فعل پر بھی کچھ نہ کہا تھا۔ میں زندگی سے اکتانے لگا تھا۔ میں منوج بھائی کی اس حرکت کو چاہتے ہوئے بھی کبھی اپنے ذہن سے کھرچ کر نکال نہ سکا۔ میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں نے ان سے کچھ نہ کہا۔ کوئی سوال نہیں کیا۔ صرف اپنی ذات کے لیے۔ بہت سے بہتے خون نظر انداز کر گئے صرف اپنی ذات کے لیے سوچا میں نے۔" وہ بلک بلک کر روتے ہوئے کہے جا رہا تھا۔

"صرف مسلمان ہی نہیں مرے تھے۔ ہندو بھی مرے تھے۔ لیکن منوج بھائی یہ سوچ کر کہ وہ اپنے دھرم کے لیے قربانی دے رہے ہیں خوش تھے۔ میں برا تھا نا عبداللہ تھا نا برا میں۔" اس کے گلے لگتے ہوئے وہ اور شدت سے رونے لگا تھا۔

اس کے جسم میں کپکپاہٹ محسوس کی جا سکتی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں ذرا سی ہلنے کی بھی طاقت نہ ہو۔ عبداللہ اس کی حالت جانتا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر اجے بیٹھا تھا۔ عبداللہ ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ چکا تھا۔

"انسان جو چاہتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو نہیں چاہتا وہ ہوتا ہے۔ میرے ساتھ وہ نہیں ہوتا رہا جو میں چاہتا تھا۔ میری زندگی مجھے گزارتی رہی ہے۔ میں زندگی نہیں گزارتا رہا۔ وقت نے مجھے اپنی مٹھی میں کیا ہے۔ میں نے وقت کو مٹھی میں نہیں کیا۔ لیکن نہیں یقیناً" کچھ دنوں بعد ایسا نہ ہو کیونکہ میں کچھ ایسا ہی کرنے جا رہا ہوں ہے نا۔" وہ عبداللہ سے کہہ رہا تھا۔

"ہاں، بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہے تمہاری زندگی میں تمہیں اپنی زندگی میں سکون ہی سکون محسوس ہوگا۔ بے اندازہ خوشی۔" اسلامک سینٹر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے عبداللہ اس سے بولا تھا۔

☼ ☼ ☼

digest library.com

"انکل میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔" سکندر آج ان کے ہاں آیا تھا۔ انکل حیات اس وقت اپنے گھر کے باہر لان میں پودوں کے ساتھ مصروف تھے۔ جنہیں وہ کافی محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں بیٹا کہو۔" وہ مصروف انداز میں بولے تھے۔

"یوں نہیں ہو سکتی یہ بات۔" وہ الجھ کر بولا تھا۔

"آؤ۔" انکل سنجیدگی سے کہتے ہوئے لان میں رکھی کرسیوں کی طرف بڑھے تھے۔

"کہو کیا بات ہے؟" ہاتھ سینے پر باندھے ہمہ تن گوش تھے۔

"بات یہ ہے کہ......" وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔

"میں دراصل جہان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں آئی مین ایک بات کرنی ہے مجھے ان سے اگر آپ اجازت دیں تو۔" وہ اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ لمحے حیات خان اس کے چہرے پر نظریں جمائے سوچ رہے تھے۔ پھر بولے۔

"تم اس سے بات کر سکتے ہو۔ لیکن اس وقت وہ گھر پر نہیں ہے۔ یوں کرو۔ تم کل آؤ' کل سنڈے ہے وہ گھر پر ہی ہو گی۔" انکل نے تفصیلی بات کرتے ہوئے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل ہی آؤں گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا تھا۔ دوسرے دن وہ اس کے گھر پر تھا۔ سنڈے کو اس کی شاپ بھی بند ہوتی تھی۔ اس لیے اس وقت وہ گھر پر تھی۔ انکل سے کافی دیر تک گپ شپ لگا تا رہا تھا وہ۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔ باہر آتے ہی جب اس کی نگاہ سکندر پر پڑی تو وہ تیزی سے اندر کی طرف مڑی تھی۔ کمرے میں آکر اس نے دھڑام سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس کی نگاہ اپنے حلیے پر پڑی تھی۔ اس کا دوپٹہ گلے میں ہی تھا۔ اٹھتے ہی گلے میں جس طرح ڈالا گیا تھا اسی حلیے میں باہر بھی نکل گئی تھی۔ اس کے بالوں کی لٹیں نکلی ہوئی تھیں۔ جسے اس نے کانوں کے پیچھے اڑس لیا تھا۔ اب تک اسے اپنے حلیے پر بے تحاشا شرم آ رہی تھی اور ساتھ ہی غصہ بھی کہ اسے اس طرح کس نے اجازت دی ہے۔ پرائے گھروں میں بیٹھنے کی۔ اب اسے چھوڑ کر اسے نانا جان پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر غصے کو کم کرنا چاہ رہی تھی۔ جو کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔ جب اس نے سکندر کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ جلدی سے اس نے دوپٹہ اپنے سر اور جسم پر پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ جس میں وہ تقریباً" ناکام رہی تھی۔ اندر آتے ہی اس پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ اور وہ بھی رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ میں اجازت لے چکا ہوں انکل سے۔" اسے اپنی پشت پر سے آواز آتی سنائی دی تھی۔

"مجھ سے اجازت لی تھی آپ نے؟" اس کے لہجے میں ترشی وہ محسوس کر گیا تھا' لیکن اسے امرت سمجھ کر پی گیا تھا۔

"شادی کرو گی مجھ سے؟" بم تھا جو اس کے کانوں کے قریب پھٹا تھا۔

"نہیں۔" اگلے ہی پل قدرے سخت لہجے میں کہتے ہوئے اس نے انکار کیا تھا۔

"ایسے کسی کی زندگی کا فیصلہ نہیں سناتے۔" وہ احتجاج کرنے لگا تھا۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔" اس کی طرف مڑتے ہوئے وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"نہیں۔" اس نے انکار کر کے اسے حیران کر دیا تھا۔ پھر وہ خود ہی جانے لگی تھی۔ جب اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا تھا۔

"ایسے نہیں جا سکتیں تم میری زندگی کا سوال ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا۔

"تم ہوتے کون ہو مجھے روکنے والے۔" اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے کہا تھا' پھر اگلے لمحے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر وہی ہاتھ مار کر اس کے ہاتھ کو تیزی سے

جھٹک دیا تھا۔
"یوں میری راہ روک کر کھڑے ہونے کی کوشش مت کرنا' ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" جوں ہی اس نے قدم بڑھائے' تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ کر اپنے سامنے کھڑا کیا اور بولا تو زہر خند لہجے میں
"کیا ہو تم' ہاں بولو کیا ہو تم۔ سمجھ کیا رہی ہو تم خود کو' میں دیوانوں کی طرح تمہارے پیچھے خوار ہوتا پھروں گا۔ اور تم دور سے میری بربادی کا تماشا دیکھتی رہو گی۔ یا آئے دن' ہر روز میں تمہاری خدمت میں پیش ہو کر یہی کہتا رہوں کہ جان مجھے تم سے محبت ہے۔ اپنی محبت بھیک کی صورت میرے کشکول میں ڈال دو۔ جب میں تمہاری محبت میں تم سے ملنے آتا تھا' تو تم مجھے آوارہ بدمعاش سمجھتی رہیں۔ اب جبکہ میں سیدھا سیدھا شادی کی بات کرنے لگا تو تم نخرے دکھانے لگیں۔ کیا چاہتی ہو تم مجھ سے؟ ایسا سلوک تو کوئی جانور سے بھی نہیں کرتا۔ جو تم مجھ سے کر رہی ہو۔ کیوں کر رہی ہوں تم میرے ساتھ ایسا؟" اس کی آواز میں واضح کرب جھلک رہا تھا۔
"ہاتھ چھوڑو میرا۔" اب کی بار وہ شاید ہوش میں آئی تھی۔
"نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک تم مجھے کوئی حتمی جواب نہیں دو گی۔" وہ ضد پر اتر آیا تھا۔
"ہاتھ چھوڑو میرا۔" وہ پھر سے بولی تھی۔
"نہیں۔"
"نانا جان۔" وہ چیخنے لگی تھی۔
"پلیز کیا بدتمیزی ہے؟" اب کی بار وہ جھنجلا گیا تھا۔
"ہاتھ چھوڑو میرا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ تبھی اس نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔
"کیا ملے گا تمہیں میرے ساتھ یہ سب کر کے؟" وہ اس کے رخ موڑنے پر بولا تھا۔
"میری بات سننے کی روادار نہیں ہو تم۔ کیوں نہیں سنتیں تم مجھے؟" اس کے دکھی لہجے پر وہ خود دکھی ہونے لگی تھی۔
"میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔" وہ رونے لگی تھی۔
"کیوں۔" وہ چلایا تھا۔
"کوئی تو وجہ ہو گی۔" وہ چلائی تھی۔
"اس لیے کہ۔۔۔" وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ دونوں گھٹنوں میں سر دیے وہ بولی تھی۔
"اس لیے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری شادی ہو گئی ہے ایک بار اب دوبارہ سے کیسے۔" وہ بھیگے لہجے میں بولی تھی۔ سکندر کچھ سن نہیں پا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ جیسے گرم ابلتے لاوے میں جلتا کوئلہ بن گیا ہو۔ اس کے بدن سے چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں۔ جو اس کے جسم کی تپش کو آخری حدوں تک لے گئی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ گر جائے گا۔ اسے ساری کائنات چکراتی' اپنا وجود چکراتا محسوس ہو رہا تھا۔
"تو کیا یہ میری نہیں ہے کسی اور کی ہے۔" اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ زندگی یہ مذاق کرے گی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔
"تمہیں نہیں پتہ۔ میں اسے بھول نہیں پاتی۔ کبھی نہیں جس کی شادی ایک مرتبہ ہو گئی ہو دوسری مرتبہ کیسے۔۔۔ میں اس کے بغیر جی رہی ہوں' لیکن اندر سے تو میں۔۔۔ ایک بھی دن میں اسے یاد کیے بغیر نہیں گزارتی۔ وہ مجھے اپنی موت کے چار سال بعد بھی بے تحاشا یاد آتا ہے۔ اب تم بتاؤ' تمہاری محبت زیادہ ہوئی یا میری بتاؤ تم مجھے۔" آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔
"میرے اندر زندگی کی ہر رونق مرجھا گئی ہے۔ میرے اندر کے سناٹے مجھے خوش نہیں ہونے دیتے۔ میں صرف جی رہی ہوں۔ تم مجھے بار بار ڈسٹرب کرنے آ جاتے ہو۔ تمہیں پتہ نہیں' کہ تم جب میرے سامنے آتے ہو تو مجھے کس قدر اذیت سے دوچار کرتے ہو۔ تمہیں نہیں پتہ میں تمہیں دیکھ نہیں پاتی ہم میں

...تم میں۔" وہ سسکتے ہوئے بولی تھی۔ "تم میں اس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ وہ تمہارے جیسا تھا۔ تم سن رہے ہونا۔ وہ تمہارے جیسا تھا۔" وہ بے خود لہجے میں اس کے خاموش و ساکت وجود کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"مت آیا کرو میرے سامنے۔" اب کے وہ التجا کرنے لگی تھی۔ "میں بہت چھپتی رہی ہوں تم سے' لیکن تم...." اس کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ لیکن وہ بدستور خاموش تھا۔ بمشکل خود کو بولنے پر آمادہ کرتے ہوئے بولا تھا۔

"تم نے جو کہنا تھا وہ کہہ دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب کہنے کو کچھ رہا بھی نہیں۔ میں... اپنی بات پر اب بھی قائم ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ...." جمان کو اس کے لہجے کی نمی بھیگے پن کا احساس ہو رہا تھا۔

"میں تمہیں اپنے بارے میں بتانے آیا تھا۔ میں اچھا تھا۔" اس کی آنکھوں میں سوالیہ حیرت کے ابھرتے ہی وہ بولا تھا۔

"میں ہندو تھا۔ میں انڈیا کا رہنے والا ہوں۔ امرتسر میں میں رہتا تھا۔ پچھلے ڈھائی سال قبل میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔ "بتا اس لیے رہا ہوں کہ کہیں تم یہ نہ کہو کہ میں نے تم سے کچھ چھپایا تھا۔ میں تہہ دل سے اسلام لایا ہوں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میری زندگی' میری خوشی کا دارومدار صرف اور صرف تمہارے ہاں یا ناں پر ہے۔ میرے بارے میں کم از کم ایک بار ٹھیک سے سوچنا ضرور۔" چند لمحے بعد وہ بولا تھا۔ "اگر زندگی میں مجھے کوئی خوشی ملے گی تو وہ یہی خوشی ہوگی۔ ورنہ تو کچھ نہیں۔" وہ اپنی نظریں اپنے بائیں ہاتھ پر جمائے ہوئے تھا۔ جس پر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے نجانے کیا لکھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ کچھ لمحوں کے لیے تو اس کی نظریں اس کے ہاتھ پر جم گئی تھیں۔ پھر دفعتاً اس نے اپنی نظریں ہٹالی تھیں۔ سکندر نیچے کارپٹ پر بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

"تم اچھے تھے" تم سکندر ہو۔ بہت کچھ آجاتا ہے۔ ان چند الفاظ کے بیچ مجھے یہ کہتے ہوئے کتنا آسان لگ رہا ہے کہ تم اچھے تھے اور اب سکندر ہو۔ لیکن ان الفاظ کے بیچ کا سفر تم نے طے کیا ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ تم نے کیا سہا۔ بہت کچھ تم نے چھوڑ دیا ہوگا۔ بہت کچھ تم سے چھوٹ گیا ہوگا۔ بہت کچھ تم سے چھینا گیا ہوگا۔ تم پر گزری میں نہیں جانتی مجھ پر گزری تم نہیں جانتے۔ تم بھی اتنی ہی آسانی سے یہ کہہ سکتے ہو کہ تم دوسری شادی کر کے اپنا گھر بساؤ۔ جتنی آسانی سے میں تمہیں اچھے سے سکندر کہہ رہی ہوں' ہے نا۔ یہ الفاظ تو میں خود بھی بول سکتی ہوں۔ مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ بولنے میں کیا رکھا ہے' میں بول تو رہی ہوں۔" وہ دھیمے لہجے میں سسکتے ہوئے بولی تھی۔

"تمہارے لیے شاید یہ کوئی اتنی بڑی بات اتنا بڑا واقعہ نہ ہو۔ لیکن میرے لیے... میرے لیے یہ ایک بم تھا۔ کہ جس کے پھٹنے کے بعد خوشی جیسے لفظ سے یہ زندگی محروم ہو گئی ہے۔ جیسے بم پھٹنے کے بعد زمین ہمیشہ کے لیے بنجر ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح میری زندگی بھی بنجر اور ویران ہے۔ زندگی مجھ پر بالکل اثر انداز نہیں ہو رہی۔" جمان نے دیکھا تھا۔ وہ بنا کچھ کہے خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور پھر کچھ کہے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی اور پھر اپنے خیالوں میں کھو سی گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

"میں اسے بھول نہیں پاتی۔ کبھی نہیں اب تم بتاؤ' تمہاری محبت زیادہ ہوئی یا میری' بتاؤ تم مجھے۔" ان الفاظ کی تکرار اس کے ذہن میں جاری تھی۔ وہ بہت الجھا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسے راستے پر کھڑا تھا۔ جہاں سے وہ اپنی منزل کا تعین نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے گھر سے واپسی کے بعد تک وہ باتیں اس کے ذہن سے چپک گئی تھیں۔ جو نکلنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ اگرچہ وہ کوشش بہت کر چکا تھا۔ لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی

تھی۔ کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنے لیے چائے بنا کر لاؤنج میں آیا تھا۔ چائے کے کپ پر انگلی پھیرتے ہوئے وہ اسی کو سوچ رہا تھا۔ "وہ مجھ سے پہلے ایک مرد اس کی زندگی میں آچکا ہے۔ تو کیا یہ بات میں برداشت کر لوں گا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ اب بھی اس کی موت کے چار سال بعد بھی۔ جس کے لیے وہ خود کو بھول چکی ہے۔ اگر میں اس کی زندگی میں آیا بھی تو میری جگہ کہاں ہو گی۔ صرف 'مصلحت' صرف 'سمجھوتا' تو کیا یہ سمجھوتا وجنتی سے نہیں ہو سکتا تھا؟" وہ خود سے بول رہا تھا۔

"آج ایک دن ایسا آئے گا۔ جب تم مجھے یاد کرو گے بے طرح۔ لیکن میں تمہارے پاس نہ ہوں گی۔ اس وقت تمہیں اندازہ ہو گا کہ تم نے کس قدر سچی محبت ٹھکرا دی تھی۔ کیونکہ جن لوگوں نے بھی اس طرح غرور و نخوت سے محبت ٹھکرائی۔ وہ بعد میں کشکول لیے محبت کی بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ ہاں ایک دن ایسا آئے گا جب تم میری باتوں کو یاد کرو گے۔"

"ہاں وجنتی وہ دن آگیا ہے۔ اب اگر تم مجھے دیکھو کہ کس طرح میں کشکول ہاتھ میں لیے کھڑا ہوں۔ تو تم قہقہے لگاؤ گی۔ تمہیں ہنسی آئے گی میری دیوانگی دیکھ کر۔ وجنتی میں نے کہا تھا نا کہ مجھے بد دعا سے ڈر لگتا ہے۔ دیکھو لگ گئی مجھے تمہاری بد دعا۔" دھیرے دھیرے خود سے بولتے ہوئے وہ صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ اپنا دایاں ہاتھ سر کے نیچے اور بایاں بازو آنکھوں پر رکھے وہ سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ آخری تصویر جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی وہ جمان ہی کی تھی۔

❀❀❀

digest library.com

"میں اپنا جواب سننے آیا ہوں۔" وہ آج اس کے سامنے پھر موجود تھا۔

"میرا خیال ہے کہ میں تمہیں جواب دے چکی ہوں۔" وہ گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے عجلت بھرے انداز میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تھی' وہ جلدی سے اس کی طرف مڑتے ہوئے اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اندر بیٹھ چکی تھی۔ جبکہ وہ دونوں ہاتھ گاڑی کے دروازے پر رکھے سر جھکائے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"ہٹو مجھے جانا ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اپنا لہجہ نرم رکھا تھا۔

"پہلے میری بات کا جواب دو۔"

"ایسے کیسے دوں۔" وہ بے چارگی سے بولی تھی۔ وہ بے بسی کی انتہا پر کھڑی تھی "بعد میں بات کریں گے۔" وہ اسے ٹالتے ہوئے بولی تھی۔

"کس وقت؟" وہ ٹلنے والا نہ تھا۔

"آج شام کو اور سنو! یہ میری تم سے آخری ملاقات ہو گی۔" اس کے ہاتھ ہٹاتے ہی وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔

سروش کمار کے اسٹور پر وہ تقریباً ڈیڑھ سال تک کام کرتا رہا تھا۔ پھر اس نے سکندر کو سنجے گپتا کے پاس بھیجا تھا۔ وہاں اس کے ہوٹل میں وہ بطور منیجر رکھا گیا تھا۔ اور یہ جاب اب تک جاری تھی۔ ایک گریجویٹ کو اس سے بہتر جاب وہاں مل بھی نہیں سکتی تھی۔ ڈاکٹر واحد سے وہ عبداللہ کے توسط سے ملا تھا۔

نیویارک آنے کے بعد وہ تقریباً ایک سال ہی گزار پائی تھی جب الیان آفریدی اور لالا برگ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گئے تھے۔ تب وہ نیویارک سے مشی گن نانا جان کے پاس چلی آئی تھی۔ الیان آفریدی اسپشلائزیشن کے بعد نیویارک کے ہاسپٹل میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اس لیے وہ وہیں قیام رکھتے تھے۔ وہ ایک ماہر سرجن تھے۔ ان کی بیوی سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں۔ الیان اور لالا بزرگ حیات خان کو سب بیچ کر نیویارک آنے کا کئی بار کہہ چکے تھے لیکن وہ اپنی برسوں کی محنت کو یوں رائیگاں جاتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انہیں اس گھر سے اس دکان سے اپنی جان سے زیادہ محبت تھی اس میں انہوں نے اپنا خون پسینہ شامل کیا تھا۔

اس وقت شام کے سائے اپنا پر پھیلا رہے تھے۔ وہ اس کی تواضع کر چکی تھی چائے اور اسنیکس کے

ساتھ۔ چائے کے کپ سے ایک سپ لیتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"تم نے کہا تھا ناکہ آج ہماری آخری ملاقات ہو گی۔ میں اس ملاقات کو تلخ نہیں بناؤں گا۔ اتنا تو میں جان گیا ہوں کہ تمہیں حاصل کرنا میرے لیے اتنا ہی مشکل ہے۔ جتنا زمین پر کھڑے ہو کر آسمان کو چھونے کی کوشش' میں نے یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ میں ہار چکا ہوں۔ تم سے' اسفند سے' تم دونوں کی محبت سے۔" اسفندیار نام لیتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ "یہی نام بتایا ہے نا تم نے" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے اور پھر اس کے دیکھنے پر سر جھکائے ہوئے بولا تھا۔ "ہاں۔" اس کی شیریں آواز اس پر عجیب سحر طاری کر رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہے۔" اپنے سر کو صوفے کی بیک پر رکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔ اس کی آواز دھیمی تھی۔

"کچھ نہیں ہے۔ اس حقیقت کے سوا کہ تم..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آئندہ کبھی بھی تمہیں تنگ کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ نہ ہی میں تمہاری راہ میں آنے کی جرات کروں گا۔ تمہارا احترام مجھ پر واجب ہے۔ میں دل میں" اپنی انگلی اپنے دل پر رکھتے ہوئے اسے پر یقین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پھر سے بولا تھا۔ "میں لپنے دل میں تمہیں اپنی عزت مان چکا ہوں۔ اب تم میری عزت ہو۔ تم مانو یا نہ مانو۔" پھر وہ اٹھ گیا تھا۔ "زندگی میں کبھی بھی تم نے شادی کا سوچا۔ تو میرے بارے میں سوچنا ضرور۔ کیونکہ ..... کیونکہ اسفند کے بعد دوسرا بھی کوئی ایک ایسا ہے جو تمہیں بے تحاشا چاہتا ہے۔ جس کے جیون میں تمہارے آنے سے بہت کچھ بدل سکتا ہے۔" یہ کہتے ہی وہ لیونگ روم سے نکلتا چلا گیا تھا۔ وہ بے چینی سے اٹھ گئی تھی اور پھر دوڑتے ہوئے لیونگ روم سے ہوتے ہوئے دروازے سے نکل چکی تھی۔ باہر لان میں کھڑی وہ اسے گاڑی تیزی سے اسٹارٹ کرتے اور بھگاتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

ایک دو دن تک تو اس کی باتوں نے اس کے اندر طوفان مچائے رکھا۔ لیکن کچھ دنوں بعد وہ سب بھول بھال گئی تھی۔ وہ نوٹ کر رہی تھی کہ پچھلے تقریباً ڈیڑھ مہینے سے وہ نانا جان سے ملنے نہیں آیا تھا۔ لیکن نانا جان کے لبوں پر اب بھی اس کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ بلکہ نانا جان نے اس سے کرید کرید کر یہ معلوم کرنے کی اپنی طرف سے اچھی خاصی کوشش کی تھی کہ اس کے ساتھ سکندر کی کیا بات ہوئی تھی اور نانا جان کی بار بار کرید پر اس نے اس کے بارے میں اس کے پرپوزل کے بارے میں سرسری بتادیا تھا۔

❊ ❊ ❊

مارچ کے مہینے میں موسم بہت خوشگوار محسوس ہوتا ہے۔ یہ خوشگوار موسم انسان کے مزاج کو بھی کافی حد تک خوشگوار بنادیتا ہے۔ رات کے کھانے کے بعد وہ ٹہلنے کی غرض سے باہر نکل آیا تھا۔ سڑک کے کنارے چہل قدمی اسے کافی لطف دے رہی تھی۔ رات کی خاموشی میں کبھی کبھار کسی گاڑی کی آواز ہلکا سا ارتعاش پیدا کردیتی تھی۔ سڑک کراس کرکے وہ قریبی مسجد سے ہوتے ہوئے کافی فاصلے پر آئسکریم بار کے سامنے جا پہنچا تھا۔ اپنی پسند کی آئسکریم لے کر بل ادا کرکے — وہ نکلا تھا۔ تو اس کی نظر ایک عدد نوجوان جوڑے پر پڑی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں آئسکریم کون پکڑے اور دوسرا ہاتھ جیب میں گھسائے' ان کو دیکھنے لگا تھا۔ ساتھ ہی اس کی توجہ پگھلتی آئسکریم پر پڑ گئی تھی۔ تبھی جلدی سے وہ اس سے ایک ایک بائٹ لینے لگا تھا۔

"میری! پلیز لسن ٹو می۔" لڑکا خوشامدانہ لہجے میں اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی غالباً" ناراض تھی۔ اس نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ لڑکی چہرے پر نہایت غضبناک تاثرات لیے اسے گھورنے لگی تھی۔

"آئی کانٹ لسن ٹو یو۔" وہ بھی جواباً" اس پر چلائی تھی۔ لڑکے نے جوں ہی اس کو کندھے سے پکڑ کر سمجھانا چاہا تھا۔ لڑکی نے بہت تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

digest library.com

"ڈونٹ ٹچ می اوکے۔" وہ غرائی تھی۔
"اوکے بٹ...."
"جسٹ شٹ اپ جیم۔" اب کے وہ پورے حلق سے چلائی تھی۔ ان دونوں کے اس "دنگل" سے وہ کافی لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے پر بگڑتے دیکھ کر اسے بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ یہ ہنسی ان کے نوٹس میں بھی شاید آچکی تھی۔ جب ہی لڑکی اس کے پاس آکر بولی تھی۔
"واٹ از رونگ ود یو۔" لڑکے کا غصہ اس پر نکالنا چاہتی تھی۔
"نتھنگ۔" اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا تھا۔ پھر ان دونوں کو لڑتا چھوڑ کر آگے بڑھتا تھا۔
"ہر مرد بیچارہ پھنسا ہوا ہے۔ بیچارہ۔" کافی دور جا کر وہ بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا تھا۔ وہ دونوں اب بھی ایک دوسرے پر برہم دکھائی دے رہے تھے۔ آئسکریم وہ ختم کر چکا تھا۔ سڑک پر جلتی روشن لائٹس علاقے کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ الیکٹرک پول کے نیچے وہ قدرے تیز روشنی کی زد میں تھا۔ سڑک کے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے وہ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا تھا۔
"اے! آر یو میڈ؟" پاس سے گزرتی دو لڑکیوں نے دلچسپی سے اس پر نظریں جمائے سوال کیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے لگی تھیں۔ وہ ان کی بات پر ہنس دیا تھا۔ پھر مزہ لیتے ہوئے بولا تھا۔
"شیور۔" اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔
"یو آر سو انٹرسٹنگ۔" ان میں سے لمبے قد والی بولی تھی۔
"تھینکس فور دا کمنٹس۔" وہ خوش اخلاقی سے مسکرا کر بولا تھا۔ وہ چلی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ چلتے چلتے اس کی نظریں سڑک کی دوسری جانب ٹیلی فون بوتھ پر ٹک گئی تھیں۔ ٹیلی فون بوتھ کے آس پاس اس وقت کوئی نہیں تھا۔ کچھ سوچتے اس نے سڑک کراس کیا تھا۔ اس کے قدم ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اکا دکا لوگ فٹ پاتھ پر پھرتے نظر آ رہے تھے۔ نمبرز ملانے کے بعد دوسری طرف فون اٹھائے جانے کا وہ انتظار کرنے لگا تھا۔
"ہیلو۔" دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا تھا۔
"جی انجلی ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔
"ہاں! پر تم کون ہو؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد استفسار کیا گیا تھا۔
"میں...." پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا تھا۔
"میں اجے ہوں۔ انجلی سے بات کروائیں۔" اسے ہولڈ کرنے کو کہہ کر وہ جو کوئی بھی تھا۔ انجلی کو بلانے چلا گیا تھا۔
"ہیلو۔" کچھ دیر بعد انجلی کی آواز سنائی دی تھی۔
"کیسی ہو انجلی؟" اس نے بوجھل آواز میں پوچھا تھا۔
"ارے تم ڈھیٹ انسان اب تمہیں میری یاد آئی' کہاں تھے اتنے عرصے سے؟" وہ چلا کر بول رہی تھی۔
"کئی زمانے ہوئے پر تم نے یاد نہ کیا۔" وہ شاعرانہ انداز سے بولی تھی۔
"یہیں تھا۔ بس وقت نہیں ملتا تھا نا اس لیے۔" وہ بہانہ بنانے لگا تھا۔
"وہ ہاں سچ میں تو بھول ہی گئی کہ تم اتنی مصروف شخصیت ہو' تمہارے پاس تو وقت بالکل نہیں ہوتا اور ہم دنیا جہاں کے بے کار فالتو بیٹھے ہوئے ہیں نا۔" وہ شاید تپی ہوئی بیٹھی تھی۔
"اوہ ہو۔ ناراض کیوں ہوتی ہو کر تو لیا نا۔" وہ احسان کر گیا تھا اس پر۔
"اچھا جی۔" اس نے اچھا جی کو کافی کھینچ کر کہا تھا۔
"اور سناؤ کیا حال ہے؟"
"ٹھیک ہوں۔" مختصر جواب دیا گیا تھا۔
"گھر سے بول رہے ہو۔" اب کی بار وہ ذرا انسانوں کے ٹون کی میں بات کر رہی تھی۔
"نہیں ٹیلی فون بوتھ سے۔"
"کیوں؟" اب کی بار وہ پھر سے چلائی تھی۔

"ایسے ہی باہر نکل آیا تھا۔ چہل قدمی کو تو یہاں بیٹھ کر مجھے تم یاد آ گئیں۔ اس لیے تمہاری یاد کے آتے ہی میں نے تمہیں فون کیا۔"

"کہاں بیٹھے تھے تم؟" اب کی بار اس کی آواز میں کچھ تھا۔

"فٹ پاتھ پر۔" اس نے ہولے سے بتا دیا تھا۔

"فٹ پاتھ پر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تم ہمیں یاد کر رہے تھے آج آج تم اس قدر اکیلے ہو وہاں کہ۔" اس کی آواز میں کپکپاہٹ اسے محسوس ہونے لگی تھی۔

لیکن اس کے باوجود وہ فون بند نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ بہت تھک گیا تھا خود سے شیئر کر کے۔ آج وہ انجلی کے ساتھ کچھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔

"آج بول دو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر تم ہم کو کیوں یاد کر رہے تھے۔ کیا اتنے بڑے ملک میں کوئی نہیں جو تمہارا دوست بن سکے؟" وہ رونے لگی تھی۔

"یہ بات نہیں، میں تو یونہی ٹہلنے کی غرض سے نکلا تھا۔ تو تھک کر یہاں بیٹھ گیا تھا۔ تم تو رونے کا بہانہ چاہتی ہو۔" اب کی بار وہ ناراض ہو گیا تھا۔

"میرے بہت سے دوست ہیں ڈاکٹر واحد، عبداللہ، باربرا، انکل حیات اور...... اور۔" اس کا نام اس کے ہونٹوں پر دم توڑ چکا تھا۔ وہ تو دوست بھی نہیں۔ "بہت سے ہیں چاہو تو ان کے نام گنوا دوں۔" اب کے لہجے میں بشاشت لیے بولا تھا۔ وہ اس درد کو کم کرنا چاہتا تھا جو اس نے اپنی ذرا سی کمزوری سے بڑھا دیا تھا۔

"انجلی میں دراصل تم سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا۔" اس کے لہجے کی سنجیدگی انجلی کو بھی سنجیدہ کر گئی تھی۔

"ہاں بولو۔" وہ کہہ گئی تھی۔

"انجلی میں مسلمان ہو گیا ہوں۔" انجلی کے ہاتھ میں زبردست کپکپاہٹ سے ریسیور گرنے لگا تھا۔ "یہ کیا کیا آج تم نے۔"

"میرا نام سکندر ہے۔ انجلی اس رب نے مجھے اپنی رحمت کی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ میرا دل ٹھہر گیا ہے۔ میں پرسکون رہنے لگا ہوں۔ انجلی میرے اندر اور باہر سکون ہی سکون ہے۔ میرا ڈر ختم ہو گیا ہے۔ انجلی مجھے کوئی خوف نہیں اور اگر خوف ہے تو خوف خدا۔ انجلی یہی حقیقت ہے جو میں نے پالی ہے۔ لیکن کبھی کبھی میرا دل بہت اداس ہو جاتا ہے۔ انجلی یہ سوچ کر کہ وہ اگر مجھے نہ ملی تو میری زندگی کسی دوسری عورت کے ساتھ کیسے گزرے گی۔ انجلی یہ اداسی مجھے ناامید کر دیتی ہے اور یہ ناامیدی مجھے بہت ڈسٹرب کرتی ہے۔"

"انجلی! تم سن رہی ہو؟" جبکہ دوسری طرف انجلی بت بنی حیرت سے دوچار تھی۔

"انجلی سن رہی ہو تم؟" اب کی بار وہ ذرا تیز بولا تھا۔

"ہاں۔" وہ جاگ گئی تھی۔

"آج میں کیا بولوں۔"

"نہیں انجلی۔" سکندر نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"آج نہیں سکندر۔"

"ہاں سکندر! کیا تم نے اس کے لیے اسلام قبول کیا ہے؟" اس کی آواز بالکل سپاٹ تھی۔

"نہیں اسلام تو میں اس سے ملنے سے قبل قبول کر چکا تھا۔ میرے مسلمان ہونے کے بعد ہی اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے وضاحت کی تھی۔

"منوج بھائی کو پتہ ہے کہ تم مسلمان ہو گئے ہو؟" انجلی کا لہجہ سنجیدہ ہی تھا۔

"ہاں۔" وہ دھیرے سے جواب دے پایا تھا۔

"وہ فون کرتے ہیں، تمہیں یا تم انہیں فون کرتے ہو؟"

"نہیں، میری آخری بات چیت ان سے وہی ہوئی تھی جب میں نے انہیں مسلمان ہونے کا بتایا تھا۔ اس کے بعد نہیں ہوئی۔" وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بتا رہا تھا۔

"کیوں؟" وہ بولی تھی۔

"کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ ہمارے درمیان بات ہو اسی لیے۔" وہ سپاٹ انداز سے بات کہہ رہا تھا۔

"اینی وے میں تمہیں فون کروں گا گھر سے۔" وہ بند کرنے لگا تھا۔

"آج سوری۔" اگلے ہی پل وہ بولی تھی "سکندر

بات سنو میری۔"

"ہاں سن رہا ہوں۔"

"میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" انجلی کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

"اور مجھے امید ہے کہ تم خوش رہو گے۔" سکندر نے اب کچھ نہیں کہا تھا۔ انجلی نے ایک سرد آہ کھینچ کر فون رکھ دیا تھا۔ ٹیلی فون بوتھ سے نکل کر وہ واپس روڈ کراس کر کے انہی راستوں پر چل پڑا تھا۔

❁ ❁ ❁

آج کل وہ متواتر ایک ہی خواب دیکھے چلی جا رہی تھی۔ کل رات بھی اس نے دوبارہ وہی خواب دیکھا تھا۔ جو پچھلے کئی عرصے سے وہ دیکھ رہی تھی۔ اور ابھی وہ نانا جان کو بھی یہی خواب سنانے بیٹھ گئی تھی۔ اس خواب نے اسے کافی بے چین کر دیا تھا۔ بلکہ رات بھر وہ روتی رہی تھی۔ خواب میں وہ اسفند کی طرف دوڑ کر اس کا ہاتھ جوں ہی پکڑ کر کچھ کہنا چاہتی ہے کہ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر غائب ہو جاتا ہے۔ نانا جان اس کا خواب سن کر ہی بولے تھے۔

"بیٹا خواب تو آتے رہتے ہیں۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" تب وہ بھی ذہن سے اس کو جھٹک دینا چاہتی تھی۔

"آج ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ جو اسے کافی حیران کر گئی تھی۔ بکے ترتیب سے رکھتے ہوئے اس کی نظریں بلا ارادہ سڑک کی دوسری جانب رکی گاڑی پر پڑ گئی تھیں۔ ڈرائیونگ سیٹ سے نکلتی لڑکی بلاشبہ وہی تھی۔ جسے اس نے مارکیٹ میں سکندر کے ساتھ دیکھا تھا۔ جبکہ دوسری سیٹ پر بیٹھے ہوئے بندے کو وہ دیکھ نہ پائی تھی۔ باربرا کو اپنی شاپ کی طرف آتے اور کھڑے ہوتے دیکھ کر اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے کہا تھا۔

"جی کیا چاہیے آپ کو؟"

"ایک بکے چاہیے تھا۔" وہ بھی جواباً خوش اخلاقی سے مسکرائی تھی۔

"کون سا؟" اس کی نظریں اب بھی سڑک پار گاڑی پر پھسلتی جا رہی تھیں۔

"یہ والا دیجیے۔" وہ بیچ میں پڑے قدرے فریش سے بکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ بکے اس کو پکڑاتے ہوئے وہ مزید صبر نہیں کر سکی تھی۔

"کس کے لیے خریدنا چاہ رہی ہیں؟" بظاہر خود کو لاپرواہ ظاہر کرتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر اسے اس بات کا یقین تھا کہ ہو نہ ہو وہ اسی کے لیے خرید رہی ہے۔

"اپنے دوست کے لیے۔" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

"پے منٹ کتنی ہے؟" اب کی بار لڑکی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ جس کی جوابی مسکراہٹ اسے نہ مل سکی تھی۔ پے منٹ کر کے جب وہ جانے لگی تھی۔ تب اس نے اس سے پوچھ ہی ڈالا تھا۔

"آپ کے دوست کا نام کیا ہے؟"

"سکندر۔" وہ مڑ کر نام بتا کر تیزی سے سڑک کراس کرنے لگی تھی۔ گزرتی گاڑی سے اس کی جھلک اس نے خود بھی دیکھ لی تھی۔

digest library.com

❁ ❁ ❁

آج سنڈے تھا۔ ڈاکٹر واحد کی بیوی شائستہ نے صبح ہی صبح فون کر کے اسے اپنے بچوں کے ہمراہ جھیل جانے کا کہا تھا۔ اس کا دل جانے کو نہ چاہ رہا تھا۔ لیکن ان کے اس قدر محبت سے کہنے پر وہ ان کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی تھی۔ انہوں نے اسے گھر ہی سے پک کیا تھا۔ راستہ بھر بچے خوشی سے چیختے چلاتے رہے تھے۔ شائستہ کے چار بچے تھے۔ تین بیٹے ایک بیٹی۔ بیٹی چھوٹی تھی جس کی عمر دو سال تھی۔ جھیل پر کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ سنڈے کو تو ویسے بھی ہر کوئی فارغ ہی ہوتا ہے۔ کافی تعداد میں بچے اور جوان لڑکے لڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ دونوں گاڑی سے اتری تھیں۔ بچے ان سے پہلے ہی اتر گئے تھے۔ شائستہ نے چھوٹی کنزا کو اسے پکڑا دیا تھا۔ اور خود شیشے

چڑھا کر گاڑی لاک کرنے لگی تھیں۔ پھر اس کی طرف آ کر کنزا کو اس سے لینا چاہا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ساتھ ہی رہنے کا کہہ کر ان کی توجہ پانچ سالہ عمر کی طرف دلائی تھی۔ جو جھیل کے پانی کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑنے لگا تھا۔ شائستہ نے بھاگ کر اسے ہاتھ سے پکڑ لیا تھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اس کے پاس آ گئی تھیں۔

"بچے نہیں آفت ہیں۔" ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ ان کی حالت دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔ پھر وہ دونوں جھیل کے پانی سے کافی فاصلے پر قدرے پر سکون سی جگہ بیٹھ گئی تھیں۔ آس پاس بچے کھیل رہے تھے۔

"چلو بیٹھو یہاں، خبردار جو پانی کے قریب جانے کا سوچا بھی۔" ساتھ ہی ساتھ شائستہ بچوں کو دھمکا بھی رہی تھیں۔ جمان کی گود میں بیٹھی کنزا کھیلتے بچوں کو دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگی تھی۔ جمان کی ساری توجہ کنزا پر مبذول تھی۔

"سنو اسفند تمہیں بھی یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ کاش ہمارے بچے ہوتے یا کہ مجھے ہی اس قدر کمی ....." وہ بڑے دکھی لہجے میں بولی تھی۔ محرومیت اس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔

"مجھے بھی اچھے لگتے ہیں بچے۔ لیکن جو اللہ کی مرضی۔ وہ جو چاہے وہی کرتا ہے۔ اس میں اس کی ہو گی کوئی مصلحت۔ پھر ڈاکٹر تو رپورٹ کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو ہو جائیں گے بچے بھی۔ تم ٹینس مت ہوا کرو۔ سمجھیں۔" وہ اسے تسلی دینے لگا تھا۔

"اگر میرے پاس اس کی کوئی نشانی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔" معاً وہ حال میں لوٹ آئی تھی۔ شائستہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیے جا رہی تھیں۔ جسے وہ غیر دلچسپی سے سن رہی تھی۔ شائستہ کی کسی بات کے جواب میں اس نے سر اٹھا کر ان سے کچھ کہنا چاہا تھا۔ تب اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر سامنے اس پر پڑ گئی تھی۔ بلاشبہ وہ وہی تھا۔ بلیک جینز بلیک ہی شرٹ جس کی آستینیں آدھی مڑی ہوئی تھیں۔ وائٹ جوگرز پہنے، سن گلاسز لگائے، اس نے ایک بچہ گود میں اٹھایا ہوا تھا اور دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ان کے ساتھ پانی کے قریب چلا جا رہا تھا۔ تبھی ان کے پیچھے بھاگتی لڑکی نے چیخ کر ان سے کچھ کہا تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ وہ بارہ تیرہ سال لگا پائی تھی۔ لڑکی نے اسکارف پہنا ہوا تھا۔ لیکن وہ جینز ہی پہنی ہوئی تھی۔ اس کی بات سن کر جب وہ پلٹ کر مڑنے لگا تھا تب اس کی نظریں کچھ فاصلے پر بیٹھی جمان پر پڑ چکی تھیں۔ لیکن اس پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد وہ ان کے ساتھ آگے چل پڑا تھا۔ شائستہ مسلسل بول رہی تھی وہ کیا بول رہی تھیں، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے سامنے بیٹھے اس شخص پر حیرت ہو رہی تھی۔ اب وہ پانی سے چھ سات قدم کے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی گود میں بیٹھا بچہ، کبھی تو پانی دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگتا اور کبھی اس کی شرٹ کھینچ کر اسے پانی میں جانے کی ضد کرتا۔ اب وہ بچے کو کچھ سمجھانے لگا تھا پھر اس نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے سامنے سے پشت کی طرف چکر دیتے ہوئے، اپنی کمر پر لٹکا لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سکندر کی گردن پر تھے۔ اور وہ بچہ پورے کا پورا اس کی پشت پر جھولا جھول رہا تھا۔ جمان کو یقین تھا کہ وہ اسے دیکھ چکا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے ایک آدمی کو اس کے پاس آتے ہوئے دیکھا تھا۔ شکل سے وہ امریکن ہی لگتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا تھا۔

"عبداللہ۔" اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی تھی۔

"وہ تو یہ عبداللہ اور ان کے بچے ہیں۔" شائستہ بھی اب کی بار انہیں دیکھ چکی تھیں۔ تبھی اسے انتظار کرنے کو کہہ کر ان کے پاس چلی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹ آئی تھیں۔

"اصل میں اس لیے ان سے ملنے گئی کہ سکندر بھی تھا۔ عبداللہ کے ساتھ۔ تو خیر پرانی بات ہے واحد سے دوستی کی۔ لیکن سکندر تو اتنا جانتا نہیں مجھے، کیسے گا کہ

دیکھ لیا تھا انہوں نے مجھے پھر بھی نہیں ملیں۔" وہ اسے تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔

پھر اس نے دیکھا تھا۔ وہ عبداللہ اور اس کے بچوں کے ساتھ وہاں کافی دیر تک بیٹھا رہا تھا۔ چھوٹا بچہ اس سے کافی مانوس لگ رہا تھا۔ وہ اس کی گود سے ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں اترا تھا۔ باپ کے بجائے وہ اس کے گلے کا ہار بنا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ان کو اٹھتے ہوئے اور اپنے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے اسے نہیں پہچانا تھا یا پہچاننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی پشت پر بے ساختہ نظریں جمائے اس نے سوچا تھا۔ وہ اس سے دور بہت دور ہوتا جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ بھی شائستہ اور اس کے بچوں کے ہمراہ چلی آئی تھی۔

واپسی پر وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ رات کو بستر پر لیٹ کر بھی اس کا ذہن انہی سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ خود کو اس کی مجرم سمجھ رہی تھی۔ اس کے دل پر عجیب سا بوجھ آن پڑا تھا۔ اپنی کیفیت کو وہ خود سمجھ نہ پا رہی تھی۔

"اگر وہ ساری زندگی شادی نہیں کر پایا تو....." یہ سوچ کر ہی وہ بہت ٹینس ہو جاتی تھی۔

"میں نے تو اسے یہ سب کرنے کو نہیں کہا بلکہ میں نے شروع ہی سے اسے ہرٹ کیا تھا۔ ڈس اپوائنٹ کیا تھا۔ لیکن اگر وہ زندگی کی ان ساری خوشیوں سے محروم رہا تو کیا یہ سب کیا دھرا میرا ہو گا؟" وہ خود سے سوال کر رہی تھی۔

"نہیں۔" پھر خود ہی اپنی تائید کرنے لگی تھی۔

"میں نے تو اسے جواب دے دیا تھا۔ بہت شروع میں' اف پروردگار میں کیا کروں۔" کروٹ بدل کر اس نے ہر سوچ کو ذہن سے جھٹک کر سو جانا چاہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ واقعی سو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بیٹا! آج میں سکندر سے ملا تھا۔" نانا جان اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے اس سے بولے تھے۔

"پانی تو دینا۔" جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر وہ نانا جان کو گلاس پکڑاتے پوچھ بیٹھی تھی۔

"کہاں نانا جان؟" اپنی یہ بے تابی اسے خود اچھی نہیں لگی تھی۔

"اس کے فلیٹ پر۔" سلاد منہ میں ڈالتے ہوئے وہ بولے تھے۔ وہ نوالہ منہ میں لے جاتے جاتے رہ گئی تھی۔

"اس کا فلیٹ کہاں سے دیکھا آپ نے؟" وہ حیرت زدہ تھی۔

"ڈاکٹر واحد سے ایڈریس لیا تھا میں نے۔"

"او اچھا۔" وہ سرہلا کر نوالہ منہ میں ڈال چکی تھی۔

"بیٹا مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا لیکن پھر بھی یہ کہہ دیتا ہوں۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا جواب وہی ہو گا جو ہمیشہ سے ہوتا ہے لیکن....." پھر چپ ہو کر وہ دوبارہ بولے تھے۔

"بیٹا سکندر اچھا لڑکا ہے۔ اگر تم اس کے بارے میں سوچتیں تو....."

"پلیز نانا جان! میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں اس بارے میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔" اس نے نانا جان کی بات کاٹ کر تیز آواز میں کہا تھا۔

"تمہارا یہی پلیز تو میری بولتی بند کر دیتا ہے بیٹا۔" وہ دوبارہ سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ پھر دونوں نے خاموشی سے کھانا کھا لیا تھا۔

کچھ عرصہ بعد اسے نانا جان کی زبانی پتہ چلا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ اسے یرقان ہو گیا تھا۔ نانا جان تو اس کی عیادت کو بھی جا چکے تھے۔ آج میڈیکل اسٹور سے نکلتے ہوئے وہ اسے دیکھ چکی تھی۔ وہ بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ وہ اسے بہت دور سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اسے اس کی حالت کا اندازہ دور سے ہی ہو رہا تھا۔ میڈیسن ہاتھ میں لیے وہ گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ پھر وہ وہاں سے چلی آئی تھی۔ سارا دن بار بار اس کا خیال آ رہا تھا۔

"وہ میرے حواسوں پر کیوں ہر وقت سوار رہنے لگا

digest library.com

ہے۔ میری بلا سے چاہے۔" غصے سے اس نے کمبل اپنے اوپر ڈال دیا تھا۔ صبح شاپ پر کام کرتے ہوئے بھی وہ وہاں نہیں تھی۔ غائب دماغی سے وہ چیزوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

"اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کی مجرم میں ہوں گی۔ مگر میں نے تو۔" دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے شاپ بند کر کے اس کے فلیٹ کا رخ کیا تھا۔ فلیٹ چونکہ دوسری منزل پر تھا۔ اس لیے زیادہ مشکل نہ تھی فلیٹ پر پہنچ کر دروازے پر ایک دو بار ہلکی سی دستک دینے کے بعد اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور حیرت انگیز طور پر دروازہ کھل گیا تھا۔ نہایت آہستہ آہستہ قدم رکھتے وہ اندر آ گئی تھی۔ اب لاؤنج سے گزرتے ہوئے خود ہی قیاس کر کے سامنے والے بیڈ روم کی طرف بڑھی تھی۔ جہاں وہ خود کچھ وقت بے ہوش رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر بستر پر بے سدھ پڑے اس پر جا پڑی تھی۔ صبح ہی صبح غالباً یہاں سے کوئی ہو کر گیا تھا۔ جبھی پورا فلیٹ اسے صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں بھی ترتیب دیکھنے کو مل رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس کے بیڈ کے سرہانے پہنچی تھی۔ وہ اوندھا لیٹا تھا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ سینے تک کمبل اوڑھے وہ نیند کی وادیوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ دو تین منٹ اسی طرح کھڑی رہی تھی۔ پھر جوں ہی اس نے پلٹ کر جانا چاہا تھا۔ تب اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ مندی مندی آنکھوں سے اس نے اسے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ پھر بولا تھا۔

"تم کیوں آئی ہو؟" پھر دوبارہ سے بولا تھا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ غنودگی میں تھا۔ وہ اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔ وہ کروٹ لے کر پھر سے سو گیا تھا۔ جبکہ وہ اس کے فلیٹ سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ وہاں سے بازار چلی گئی تھی۔

کچن میں کھٹ پٹ کی آواز سے اس کی نیند میں خلل پڑ گیا تھا۔ کچھ دیر تک تو خالی الذہنی کی کیفیت میں پڑا رہا تھا۔ پھر جب آواز کا سلسلہ تسلسل سے جاری رہا تو وہ بستر سے اٹھ گیا تھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔ جب اس نے اسے کچن میں دیکھا تھا۔

"تم یہاں یہ کیا کر رہی ہو؟" اسے خوشی سے زیادہ حیرت ہو رہی تھی۔ جس کا اظہار اس کے چہرے سے بھی ہو رہا تھا۔

"کھچڑی بنا رہی ہوں اور یہ سلاد بھی' یرقان میں بہت زیادہ پرہیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھچڑی بھی گھی یا تیل کے بغیر ہی بنے گی۔" اس پر سرسری نگاہ ڈال کر وہ دوبارہ سے سلاد کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ کھیرا' مولی' ٹماٹر' پیاز' سلاد کے پتے کاٹ کر اب اسے ایک بڑے باؤل میں ڈال کر فریج میں رکھنے لگی تھی۔

"یہاں کھڑے کھڑے تم دن گزارو گے؟" اسے کچن میں حیرت کی تصویر بنے دیکھ کر وہ کوفت سے بولی تھی۔

"یرقان میں زیادہ پھرنا کھڑے ہونا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس میں آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب جاؤ اور آرام کرو۔" وہ اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے کچن سے نکل آیا تھا۔ لیکن اپنے بیڈ روم کے بجائے وہ لاؤنج میں صوفے پر ہی لیٹ گیا تھا۔ بیڈ روم سے وہ اسے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ جبکہ لاؤنج کے صوفے پر لیٹے وہ اسے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ کسی چیز کی تلاش میں پورے کچن کا جائزہ لیتے ہوئے جب اس کی نگاہ بے ساختہ اس پر پڑی تو وہ اس کو دیکھنے میں منہمک تھا۔ اس کے دیکھنے اور اپنی چوری پکڑے جانے پر وہ خجل سا ہو گیا تھا۔ اپنا بایاں بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ کچھ لمحے بعد وہ اس سے دور دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاسپٹل میں کتنے عرصے رہے ہو تم؟"

آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے اور بیٹھتے ہوئے وہ بولا تھا۔ "تقریباً دس دن۔"

"اب کیسا محسوس کر رہے ہو تم؟" اس کی نظریں سامنے لاؤنج میں پڑے کرسٹل کے گلدان پر تھیں۔

"اب تو کافی اچھا ہے پہلے سے۔" وہ آہستہ آہستہ

ہی بول رہا تھا۔

"تمہارے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ چینج کرو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی تھی۔

"سنو۔" اس کی آواز پر وہ رک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ پھر اس نے نظریں جھکالی تھیں۔

"تم میرے کمرے میں آئی تھیں جس وقت میں سو رہا تھا۔ یا میں خواب دیکھ رہا تھا۔" وہ بڑی آس سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں! میں تھی۔" پھر وہ دوبارہ سے کچن میں چلی گئی تھی۔ کھچڑی بنا کر وہ ایک ہاٹ پاٹ میں ڈال رہی تھی۔ سارا کچن صاف کرنے کے بعد وہ نکلی تھی۔

"میں جا رہی ہوں۔ کھچڑی میں ٹیبل پر رکھ چکی ہوں۔ جبکہ سلاد فریج میں ہے۔ کھانے سے کچھ دیر پہلے نکال لینا فریج سے ورنہ بہت ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"یہ سب تم بازار سے لائی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا تھا۔ جوں ہی اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تب وہ بول پڑی تھی۔

"مجھے ضروری کام ہے ایک۔" یہ کہتے ہی وہ نکل گئی تھی۔ آنکھیں بند کیے وہ تخیل میں بند دروازے کے پیچھے اس کے عکس کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہاں بھی اس کے ناراض چہرے کو دیکھ کر جھٹ سے اس نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی خفگی کے ڈر سے۔

digest library.com

دوسرے دن وہ پھر اس کے فلیٹ پر پہنچ گئی تھی۔ دروازے پر دستک دینے کے بعد وہ اس کے کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس بار دستک دینے کے ساتھ ہی دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ آج دوبارہ اسے یہاں دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ اسے اپنا وہم تصور کر رہا تھا۔

"جگہ دو گے اندر آنے کے لیے۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

"آں ہاں آؤ۔" وہ اپنی خجالت مٹاتے ہوئے اسے راستہ دے رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک درمیانے سائز کا ڈونگہ تھا اور ایک شاپنگ بیگ، جس میں کچھ چیزیں تھیں شاید۔ وہ اسے کچھ کہے بغیر کچن کی طرف بڑھ چکی تھی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھ کر خود سے اپنی حیرانگی شیئر کر رہا تھا۔

"میں ابلے ہوئے چھولے لائی ہوں اس کے اوپر سبزی ڈال دی ہے میں نے تاکہ تمہیں اس کا ٹیسٹ اچھا لگے۔ اس کے علاوہ یہ الائچی اور گرین ٹی کے پتے بھی ہیں۔ میں لے آئی ہوں ہو سکتا ہے یہاں ہو۔ لیکن یہ سوچ کر لائی ہوں کہ شاید نہ ہو۔ چائے پینی ہو تو صرف گرین ٹی ہی پینا۔ یرقان میں دودھ کی چائے نہیں پینی۔ بزرگ کہتے ہیں۔" اس کے سوالیہ انداز پر وہ بولی تھی۔ پھر وہ کچن میں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تھی۔ ہاتھ میں ایک بڑا مگ تھا۔ جو اس نے اسے تھما دیا تھا۔

"گنے کا جوس لائی ہوں میں وہ میں نے فریج میں رکھ دیا ہے۔ اس بیماری میں بہت مفید ہے۔" (یہ تو نرس بن گئی ہے۔) کچھ دیر بعد وہ چلی گئی تھی۔

آج وہ اسے دہی چاٹ کھلا رہی تھی۔ "لیکن مجھے دہی نہیں پسند۔" یہ جملہ کوئی دسویں بار اس نے دہرایا تھا۔ اب کی بار تو اسے آگ لگ گئی تھی' اس کے اس لاڈ بھرے جملے پر۔

"سنو میں تمہاری بزرگ نہیں ہوں۔ یہ لاڈ نخرے تم کسی اور کے ساتھ کیا کرو۔" اور پھر ایک دم سے اس نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا دیا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن خفت کے مارے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ پھر بلا ارادہ اس پر نظر پڑی تو اس کے ہونٹوں پر تبسم دیکھ کر وہ کچن میں چلی گئی تھی۔ وہ اپنے بیڈ روم چلا گیا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں بیٹھا میڈیسن لے رہا تھا۔ جب وہ خاموشی سے اندر آ گئی تھی

سکندر نے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر اپنے بیڈ پر سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"تمہارے میلے کپڑے......"

"صاف ہیں وہ سب ڈاکٹر واحد کی بیوی لے گئی

تمہیں دھونے۔" اس نے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا تھا۔

"وہ بلیو کلر کا سوئیٹر وہ۔" اس کے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھ کر مزید بولی تھی۔

"وہی جو اس دن تم نے پہنا ہوا تھا۔ وہی سوئیٹر۔" پھر اس نے اس کے ہاتھ میں سوئیٹر تھما دیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے سوئیٹر لیتے ہوئے وہ بڑے ملتجی لہجے میں بولی تھی۔

"تم شادی کیوں نہیں کرتے؟" سکندر نے اس پل اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی تھی۔

"کیوں کر رہے ہو تم اپنے ساتھ ایسا؟" وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔ وہ خاموش رہا تھا۔

"تم سے پوچھ رہی ہوں میں؟؟"

"میرا دل نہیں مان رہا۔" وہ آہستہ سے بولا تھا۔

"کیوں نہیں مان رہا تمہارا دل؟" وہ سخت لہجے میں بولی تھی۔ چند لمحے تو وہ اسے دیکھتا رہا تھا۔ پھر بولا تھا۔

"دماغ خراب ہے اس کا۔" پھر مڑ کر میڈیسن کی ایک بوتل کھول کر چمچے سے اس نے دوا اپنے منہ میں ڈالی تھی۔

"دیکھو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر کچھ سوچتے ہوئے اس کو سمجھانے لگی تھی۔ لیکن اس نے اسے کوئی موقع نہیں دیا تھا سمجھانے کا۔

"اگر تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ ہے۔ یا تمہارے اندر خوف ہے کسی بھی قسم کا تو تمہیں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بہت آہستہ آہستہ کہنے لگا تھا۔

"تم نے مجھ سے کوئی بے وفائی نہیں کی۔ میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔ اس لیے میرے معاملے میں تم بالکل آزاد ہو ہر قسم کے الزام سے تم نے مجھ سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ تو پھر تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ میں کیا کرتا ہوں۔" اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ گلاس ونڈو کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں باہر کچھ کھوجنے لگی تھیں۔ وہ اس کو بغور دیکھنے لگی تھی۔

"مجھ پر بوجھ ہے۔ جب تم میری وجہ سے شادی نہیں کرو گے۔ تو مجھ پر بوجھ ہی رہے گا۔ میں چاہوں بھی تو اس احساس سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتی کہ تم میری وجہ سے اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔" قدرے سخت اور تیز لہجے میں بولی تھی وہ۔

"پلیز اسٹاپ اٹ۔ تم میری توہین کر رہی ہو۔ میں اپنی زندگی برباد نہیں کر رہا۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگ رہا۔ کچھ نہیں چاہ رہا۔ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو مرنے دو مجھے 'مت آؤ میرے سامنے۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولا تھا۔

کچھ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے تھے۔ پھر وہ بہت خاموشی سے ایک ایک قدم اٹھاتا اس کے نزدیک کھڑا ہوا تھا۔

"ایک ایسا حل ہے کہ جس سے میری شادی ممکن ہو سکتی ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے وہ بولا تھا۔ جبکہ وہ اس پر سے اپنی نگاہیں ہٹا کر اس سے کافی فاصلے پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔

"میں تب شادی کروں گا جب میں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ جب میرا دل راضی ہو جائے۔ اور جس دن ایسا ہو گا۔ اس دن میں شادی کر لوں گا۔ کسی بھی لڑکی کے ساتھ۔ لیکن جس دن تم نے شادی کا سوچا۔ تب تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہو گی۔ صرف مجھ سے اب کہو تمہیں منظور ہے؟" وہ نہایت سکون سے ایک ایک لفظ بول رہا تھا۔

"کہو نا تمہیں منظور ہے؟" چیلنج کے انداز میں وہ پھر سے بولا تھا۔

"ہاں۔" وہ اٹل لہجے میں بولی تھی۔

"منظور ہے مجھے۔" پھر وہ تیزی سے پلٹتے ہوئے بولا "ہم اس وقت تک نہیں ملیں گے۔ جب تک کہ تم یا میں کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ جائیں۔"

پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اس کی راہ میں نہ آیا تھا۔

❁ ❁ ❁

نانا جان کے پاس بیٹھے وہ الفاظ ترتیب دے رہی

تھی کہ کس طرح انہیں اپنے یہاں سے جانے کے بارے میں بتا دے۔

"نانا جان میں چاہتی ہوں کہ ہم نیویارک چلے جائیں۔" کتاب کا مطالعہ کرتے نانا جان کو شدید شاک لگا تھا۔

"تمہیں بیٹھے بٹھائے نیویارک جانے کی کیا سوجھی" کتاب بند کر کے اب وہ براہ راست سوال کر رہے تھے۔

"میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ کچھ عرصے کے لیے پلیز نانا جان۔" اس کی آواز سے بے بسی واضح جھلک رہی تھی۔

"کچھ عرصے کے لیے ہی بس صرف اس وقت تک جب تک وہ کہیں شادی نہ کر لے۔"

تب نانا جان اس کی بات کی تہہ تک پہنچے تھے اور بولے۔

"بیٹا اگر تم اس کے ساتھ شادی کر لو تو یہ زیادہ بہتر ہو گا تمہارے لیے بھی۔ اور اس کے لیے بھی میرے بعد کیا کرو گی تم؟ اکیلے یہاں کیا کرو گی بولو؟"

"پلیز نانا جان آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ کچھ عرصہ ہی کی تو بات ہے۔" پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ نانا جان کے سامنے یوں کھل کر بولی تھی۔

"نانا جان! میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔" حزن و ملال اس کے چہرے پر مستقل بسیرا کیے رہتا تھا۔

"میں اس آواز، اس وجود کو کیسے بھول سکتی ہوں کہ جس کے بارے میں میں نے پندرہ برس کی عمر میں یہ جانا کہ وہی میرا ہمسفر ہو گا۔ نانا جان مجھے کہا گیا تھا کہ اس کے علاوہ میں کسی کے بارے میں نہ سوچوں۔ اب بھی میرے کانوں میں امی کی آواز گونج رہی ہے کہ بیٹا تم اپنی تمام تر سوچیں اسی سے منسوب رکھو۔ اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں نہ سوچنا۔ ایک آزاد معاشرے سے ایک ڈری سہمی ماں نے اپنی بیٹی کو اوائل جوانی میں ہی اس کے مستقبل کے بارے میں بتا دیا تھا۔ جس لڑکی نے پندرہ برس کی عمر میں پہلی مرتبہ اپنے نام کے ساتھ کسی لڑکے کا نام لگتا سنا ہو۔ دن رات اس کے ذہن میں اس کی تصویر رہی ہو۔ اس کی سوچ کا محور وہی رہا ہو۔ پندرہ برس کی عمر تک دیکھا وہ لڑکا اس کے خیالوں اور سوچ میں آن بسا ہو سڑک پہ آتی جاتی، کالج میں پڑھتی، بازار میں شاپنگ کرتی پارک میں تفریح کی غرض سے جاتی یہ لڑکی اس لیے کسی پر نظر نہ ڈالتی ہو کہ وہ کسی کی امانت ہے۔ کسی اور پر نظر ڈالنے سے اگرچہ وہ سرسری ہو۔ وہ گناہ کی مرتکب ٹھہرتی ہو اپنی نظروں میں۔ کیا یہ ثابت نہیں کرتا نانا جان کہ وہ لڑکی کس قدر محبت کرتی ہو گی اس شخص سے۔ جس کے لیے وہ خود کو ہر سوچ کو صاف رکھتی آئی تھی۔

اپنی ہستی کو مٹا کر کسی دوسری ہستی میں ڈھل جانا بہت مشکل اور پیچیدہ امر ہوتا ہے۔ لیکن میں نے یہ سر انجام دیا کیوں؟ اس لیے کہ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ نہیں بھول سکتی میں اسے۔ کسی اور کے بارے میں سوچتے ہوئے اب بھی مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں گناہ کر رہی ہوں۔ نانا جان پتہ نہیں کیوں، پر اب بھی مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں کسی دوسرے بندے کے بارے میں سوچ کر، اسے دیکھ کر گناہ گار ہو رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے اسفند مجھ سے

عمران ڈائجسٹ کے مقبول سلسلہ

اپسرا

سرزمین مصر سے جنم لینے والی ایک تحیر خیز حیرت انگیز کہانی ایک راز کی داستان جس کی حفاظت بہت ضروری تھی۔

مکمل دو حصے فی حصہ/ ۱۵۰ روپے

ہم سے براہ راست منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۴۲ اردو بازار کراچی

روٹھ جائے گا۔ میں اسے خفا نہیں کر سکتی۔ میں اسے خفا نہیں دیکھ سکتی۔ کبھی نہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ پھر وہ نانا جان کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔

"پلیز نانا جان! صرف آخری بار' صرف آخری موقع دیں مجھے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مایوس ہو کر شادی کر لے۔ پلیز نانا جان۔" اس کی آنکھوں سے بہتے اشکوں میں شدت آتی جا رہی تھی۔ نانا جان نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" پھر بولے تھے۔

"یہ گھر اور دکان اس کا کچھ انتظام کیا ہے۔ کس کے حوالے کرو گی تم؟" ان کے چہرے پر فکر نمایاں تھی۔

"سپنا سے کہہ چکی ہوں میں وہ سنبھال لے گی۔ وہ قابل بھروسہ ہے۔ گھر پر بھی چکر لگایا کرے گی۔ میں اس سے بات کر چکی ہوں۔ ٹھیک ہے نا۔" اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر جاتے جاتے وہ پلٹ کر نانا جان کے گلے لگتے ہوئے بولی تھی۔

"نانا جان میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔" انہوں نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے اپنا سر نفی میں ہلا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

ڈیٹرائٹ سے نیویارک کا سفر انہوں نے بائی کار (بائی روڈ) طے کیا تھا۔ جو کم و بیش دس' بارہ گھنٹے پر محیط تھا۔ نیویارک میں واقع اس گھر سے اس کی بیشتر یادیں وابستہ تھیں۔ یہاں ماں باپ کے مہربان وجود کے لمس کی خوشبو تھی۔ اس کا بچپن' اس کی جوانی اس گھر کے کونے کونے سے اس کی شرارت بھری کھلکھلاہٹیں' لڑکپن کے اونچے شگفتہ قہقہے کئی یادوں کے در وا کر گئی تھی۔ یہ مکان وہ کرائے پر دے چکی تھی۔ ان کی آمد سے قبل عینی نے شارٹ نوٹس پر کرائے داروں سے مکان خالی کروا لیا تھا۔ کئی دن ان کو یہاں ذہنی اور جذباتی طور پر سیٹ ہونے میں لگے تھے۔ اس گھر سے اس کی گہری وابستگی فطری تھی۔ زندگی گزر رہی تھی یا شاید گزار رہی تھی۔ اسے خود نہیں پتہ تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔

❁❁❁

digest library.com

یہ بہت شاکنگ نیوز تھی۔ اس کے لیے اس خبر نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے عہد کا پکا تھا۔ لیکن اسے یہ گماں تک نہیں گزرا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ اسے یہ خبر ڈاکٹر واحد سے پتہ چلی تھی۔ اس کے کریدنے پر کہ آج کل انکل حیات نظر نہیں آتے۔ وہ بولے تھے کہ وہ نیویارک چلے گئے ہیں۔ تب بے ساختہ وہ بولا تھا۔

"کیا سب کچھ بیچ کر ہمیشہ کے لیے۔"

"نہیں یار کہہ رہے تھے کہ وہاں کچھ کام نمٹانے ہیں۔ کچھ عرصے میں آجائیں گے۔"

گھر تک کا فاصلہ کیسے طے ہوا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں آگ سی جل رہی تھی۔ وہ اس آگ کے الاؤ میں دہک رہا تھا۔

"تو کیا وہ یہ سمجھ رہی ہے کہ اس طرح سے میں مایوس ہو کر اپنا ارادہ ترک کر دوں گا۔" شرٹ کے اوپر پہنی جیکٹ اتار کر اس نے غصے سے پرے پھینک دی تھی۔ شوز بے دلی سے اتار کر ادھر ادھر کہیں ڈال دیے تھے۔ اب بیڈ پر ٹانگیں نیچے لٹکائے اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے وہ لیٹ گیا تھا۔

"کتنا عرصہ دور بھاگو گی مجھ سے۔ جمان الیان میں صبر کر سکتا ہوں تم یہ کیوں بھول جاتی ہو۔" یاسیت بھرے انداز میں وہ خود سے بولا تھا۔

اس نے سنا تھا کہ تہجد کے وقت مانگی دعا قبول ہوتی ہے۔ وہ راتوں کو اٹھ کر تہجد پڑھنے لگا تھا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہی اس کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ پھر وہ گڑگڑا کر اپنے رب سے اسے مانگنے لگتا تھا۔ وہ اس کی دعاؤں میں شامل ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ذات کو فراموش کر چکا تھا۔ ہر وقت اس کے دل و دماغ پر وہی چھائی رہتی تھی۔ پھر وہ کثرت سے قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگا تھا۔ دل کو ٹھہراؤ اور سکون مل رہا تھا۔ دل اطمینان کی دولت سے سرشار ہونے لگا تھا۔ تب

زندگی مثبت اور خوب صورت لگنے لگی تھی "اللہ کی ہی ذات ہے۔ نوازنے والی اگر وہ ہے میری قسمت میں تو حل کر رہے گی۔" وہ خود کو سمجھانے لگا تھا۔

ڈاکٹر واحد کے گھر کا فون ملاتے ہوئے وہ تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے نمبر ڈائل کیا تھا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے فون انہوں نے ہی اٹھایا تھا۔

"اسلام علیکم!" ڈاکٹر واحد کی آواز پہچان کر جھٹ سے سلام جھاڑا تھا۔

"وعلیکم اسلام! کیسے ہو۔" کچھ دیر تک توان کے درمیان ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر اس نے حیات خان کے بارے میں کچھ اس انداز سے بات شروع کی تھی کہ جس سے ڈاکٹر واحد کو اس کے پوچھنے پر کوئی اچنبھا نہ ہوا تھا۔

"آپ کے پاس ان کا فون نمبر ہے۔" اب کی بار وہ بات کہہ ہی دی۔ جس کے لیے وہ اس قدر بے تاب ہو رہا تھا۔

"نہیں یار! ان کا فون نمبر تو نہیں ہے میرے پاس۔ انہوں نے کبھی بھی فون نہیں کیا نا۔ اس لیے بھی مجھے ان کا نمبر نہیں معلوم۔"

"ہوں۔" پھر کچھ دیر کی گپ شپ کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔ پھر اس نے اس کی شاپ پر موجود سیلز گرل سے بھی نمبر معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن لڑکی نے یہ کہہ کر معذرت کی تھی کہ اسے خود نہیں معلوم کیونکہ رابطہ مس جہان الیان ہی کرتی ہیں۔ پھر وہ اس کا انتظار کرنے لگا تھا۔ اسے خود پر بھروسہ تھا۔ وہ اس کے لیے قیامت تک کے لیے انتظار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد دو سال کیسے گزرے تھے اسے پتہ بھی نہیں چل سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

پیسے کاؤنٹر پر جمع کرا کے وہ مارکیٹ کے گلاس ڈور کو دھکیل کر نکلا تھا۔ اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگز اپنے بائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے۔ اس نے گلاسز اپنی آنکھوں پر لگائے تھے۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ گاڑی کے پاس پہنچا تھا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس میں شاپنگ بیگز رکھ دیے تھے۔ پچھلا دروازہ لاک کر کے اگلی سیٹ کا دروازہ جوں ہی کھولنے لگا تھا۔ تب ایک لحظہ کو اس نے سڑک پر ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ لیکن اس سمے وہ بت بن گیا تھا۔ اس کا وجود جھٹکوں کی زد میں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے تیز و تند طوفان اسے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جا رہا ہو۔ وہ بت بنا کھڑا تھا۔ وہ اس کے وجود سے بے خبر گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔

اس کی گود میں موجود بچہ دیکھ کر تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ کب وہ اس کے گھر پہنچا اسے خبر نہ تھی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے بہت زور سے دروازہ بند کیا تھا کہ اس کا دھماکا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ تیز تیز قدموں سے وہ دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی وہ نظر آ گئی تھی۔ لیونگ روم میں کارپٹ پر بیٹھی وہ بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ تب تقریباً" دوڑنے کے انداز میں چلتے ہوئے وہ اس کے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ دروازے کی طرف پشت ہونے کی وجہ سے وہ اسے دیکھ نہیں پائی تھی۔ وہ فوراً" اپنا دوپٹہ اپنے سر اور جسم پر پھیلانے لگی تھی۔

"تم۔۔۔" وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی۔ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی جب اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا تھا۔

"کہا تھا نا میں نے کہ۔۔۔ تم نے کیا کیا میرے ساتھ؟ وعدہ کیا تھا نا تم نے۔ کہ اگر تم شادی کرو گی تو مجھ سے پھر کیوں؟" وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"کیا کیا تھا میں نے تمہارے ساتھ، کیا کیا میں نے تمہارے لیے۔ دو سال۔۔۔ دو سال تک میں ایسے ہی پھرتا رہا۔ تمہیں اندازہ ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے دو نہایت قیمتی سال ضائع کیے۔ تمہیں جانور نظر آتا ہوں میں۔ تمہاری نظر میں میری زندگی کے دنوں، مہینوں،

digest library.com

سالوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس قدر بے وقعت ہوں میں کہ تم نے میری زندگی کے لمحوں کے ساتھ کھیلنا شروع کیا۔ تم نہایت بے رحم عورت ہو نہایت ظالم۔" وہ پورے حلق کے بل چیخا تھا۔

"اگر تم دس سال بعد ملتیں تو کیا تمہاری نظر میں میری زندگی کے دس سال کچھ بھی نہیں تھے؟ تم سے کہہ رہا ہوں میں بولو کیا دکھتا ہوں میں تمہیں۔ تمہاری نظر میں میں اس قدر حقیر ہوں کہ تم مجھے بغیر بتائے..... تمہارے لیے دو سال کچھ نہ ہوں گے۔ پر میرے لیے یہ دو صدیاں تھیں۔ سمجھیں تم ایک ایک پل مجھ پر بھاری تھا۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ گم صم تھی۔ دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے وہ بولا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"راتوں کو اٹھ کر میں نے اپنے رب سے تمہیں مانگا تھا۔ میرے لبوں پر یہی دعا تھی کہ تم نے..... تم نے۔" وہ رونے لگا تھا۔ آنسو اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

"یہ کیا کیا تم نے میرے ساتھ؟ میں انتظار تو کر رہا تھا۔" اس کی آواز میں دکھ ہی دکھ بول رہا تھا۔

"کیا چاہتی تھیں تم مجھ سے؟ بولتیں تم۔ میں وہ بھی کر کے دکھاتا۔ کونسی تمہاری شرط تھی۔ جو میں پوری نہیں کر سکتا تھا۔ بولو تم۔" اس کا بازو دبوچے وہ چیخ رہا تھا۔

"تم ایک نہایت ناشکری عورت ہو۔ ہر وقت ہر پل ناشکری کرنے والی۔ زندگی ایک نعمت ہے لیکن تم اس سے یوں منہ موڑ کر کھڑی تھیں جیسے بندہ کسی ناپسندیدہ چیز پر منہ بنائے۔ ہر کسی کو اس قسم کے حالات پیش آتے ہیں۔ لیکن وہ اس طرح سے زندگی سے الگ ہو کر نہیں بیٹھ جاتے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمت پر منہ نہیں بناتے۔ کیا مجھے تکلیفوں سے نہیں گزرنا پڑا تھا؟ اگر تم اپنے جسم پر چادر چڑھائے اسلام کے چند فرائض ادا کر کے یہ سمجھ رہی ہو کہ تم ایک سچی مسلمان ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ دن رات اللہ کی ناشکری کرنے والا کبھی اچھا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ تم کیا سوچ کر اللہ سے ضد باندھے بیٹھی تھیں کہ اس نے تمہارا شوہر اور تمہارے ماں باپ چھین کر تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ کیا یہی ثابت کر رہی تھیں تم؟"

"نہیں۔" وہ اس کے غلط الزام پر تڑپ اٹھی تھی۔

"کیا مطلب تھا اس سب کا اس ناشکرے پن کا تم ضد کیے بیٹھی تھیں 'یہ تم مان لو۔" اب کے وہ سفاکی سے بولا تھا۔ "تم ایک خود غرض عورت ہو۔ تم صرف اپنے لیے جیتی رہی ہو۔ صرف اپنے لیے تمہیں اپنے ماں باپ کا کوئی خیال نہیں تھا۔ تم نے ہی مارا ہے انہیں۔ وہ تمہاری خوشیوں کی آس لیے اس دنیا سے چلے گئے۔ کبھی جھوٹ موٹ بھی تم نے ان کے سامنے خوش رہنے یا اپنے نانا کو خوشی دینے کی کوشش نہیں کی۔ جاؤ پوچھو اس بوڑھے آدمی سے 'کس طرح وہ تمہاری وجہ سے پریشان رہے تھے۔ اپنے لیے جیتی رہی ہو تم۔ بس کس کھاتے میں ہوں۔ تم نے تو اپنے گھر والوں سے بدترین رویہ رکھا۔ ان کو دکھ پہنچائے۔" وہ چیخ چیخ کر کہتے ہوئے اسے آئینہ دکھا رہا تھا۔

"تم ایک بدترین عورت ہو۔ میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔ بہت برا کیا تم نے میرے ساتھ۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم نے پہلے شادی کا سوچا تو تم مجھ سے کرو گی۔ بولو کہا تھا نا۔" وہ اس کا بازو دبوچے اس پر چیخ رہا تھا۔ وہ دم بخود سن رہی تھی۔

"ہاتھ ہٹاؤ اپنا۔" وہ اپنے حواس میں آچکی تھی۔

"ہاتھ ہٹاؤ اپنا۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے دھکا دیا تھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً کھینچتے ہوئے صوفے تک لے گئی تھی۔ اسے دھکا دیتے ہوئے اسے صوفے پر گرا دیا تھا۔ پھر وہ کچن میں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسے ایک گلاس سمیت آتی دکھائی دی تھی۔

"پانی پی لو۔" وہ اسے تاسف سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"نہیں پینا مجھے۔" وہ اٹھ گیا تھا۔

"بیٹھو تم۔" اب اس کے لہجے میں اسے غصے کی

جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

"پہلے پانی پی لو پھر بات ہوگی۔" وہ اس کے ہاتھ میں تھامے گلاس کو پکڑتے ہوئے پانی غٹا غٹ پی گیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ سے گلاس تھام کر ٹیبل پر رکھ چکی تھی اور خود دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ بچی پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ پھر نہایت کرب سے اس نے اپنی نظریں پھیر کر اپنے جوتوں پر جمادی تھیں۔

"اگر کچھ اور کہنا ہو تو وہ بھی کہہ دو' تمہارے تمام خیالات سن کر مجھے ازحد خوشی ہوگی۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی تھی۔ درد کی ایک لہر اس نے اپنے سینے میں محسوس کی تھی۔ اس میں زندہ رہنے کی ہر امنگ ختم ہو گئی تھی۔

"میں نے شادی نہیں کی۔" اس کے لبوں سے نکلتے اس جملے پر زندگی پھر سے جاگ اٹھی تھی اس کے اندر باہر کا موسم یکایک خزاں سے بہار بن گیا تھا۔

"یہ بچی جسے تم دیکھ رہے ہو میری نہیں ہے۔ یہ میری دوست عینی کی بچی ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی ہے یہاں میرے گھر پر۔ نیویارک سے آئی ہے ہمارے ساتھ۔ چند دن رہے گی یہاں کچھ دن کے لیے ہم یہاں آرہے تھے تو وہ بھی ہمارے ساتھ آگئی۔ وہ نانا جان کے ساتھ کسی عزیز کے گھران سے ملنے گئی ہے۔ بچی کو اکیلے میں گھر پر چھوڑ نہیں سکتی تھی اس لیے اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی مارکیٹ' شاپنگ کرنے۔" اب وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لہجے میں اس سے بات کر رہی تھی۔

اس کی وضاحت وہ صحیح سن نہیں پایا تھا۔ وہ اپنی بد تمیزی اور نہایت بری گھٹیا حرکت پر کڑھ کر رہ گیا تھا۔ اس کے خیال میں اس نے جمان کی نظر میں اپنا تھوڑا بہت احترام بھی کھو دیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد بغیر کچھ کہے وہاں سے چلا آیا تھا۔

❀ ❀ ❀

رات کو کروٹیں بدلتے وہ اس کی باتیں سوچ رہی تھی۔ اسے عجیب سی بے کلی ہو رہی تھی۔ آج کے اس واقعہ نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ابھی تک اسی واقعہ کے زیر اثر تھی۔

"راتوں کو اٹھ کر میں نے تمہیں اپنے رب سے مانگا تھا۔" اس کی کہی یہ بات اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اب تک وہ اپنی راہ بدل چکا ہوگا۔ اس کے خیال میں یہ اس کا وقتی جذباتی ابال تھا کہ اس عمر میں لڑکے ایسا کرتے ہی ہیں۔ یہ عشق عاشقی کر کے کچھ دن بعد بھول جاتے ہیں۔ لیکن آج اسے دیکھ کر اسے سن کر اسے لگا تھا کہ وہ اپنے قول پر استقامت سے جما ہوا ہے۔ اس کا ارادہ اٹل تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسے آئینہ میں اس کا چہرہ دکھا گیا تھا۔

"کیا واقعی میں ناشکری عورت ہوں؟" اٹھتے ہوئے وہ خود سے بولی تھی۔

"کیا واقعی میں ضد کرنے لگی ہوں؟ قانون قدرت سے۔" وہ بے چین ہو کر بیڈ سے اتر گئی تھی۔

"اگر اس نے مجھ سے چھینا تو اس نے مجھے دیا بھی۔ پھر میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ یہ مجھے پسند نہیں' کیونکہ جو مجھے پسند تھا۔ وہ مجھ سے چھین لیا۔

کیا ہے یہ؟ انکار اس قدر کھلا انکار' شیطان نے سجدے سے انکار کیا تھا۔ کیونکہ وہ اس عظمت پر خوش نہ تھا جو اسے حاصل تھی۔ بلکہ اور کی چاہ میں اور کی حرص میں اس نے اپنا مقام اپنا مرتبہ کھو دیا وہ کم پر خوش نہ تھا۔ وہ ناشکرا تھا اور میں بھی تو ناشکری ہوں تو کیا میں۔۔۔ اف میرے پروردگار میں کس قدر خود غرض ہوں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"کیا ہوگا میرا؟ اس قدر خود غرض ہو گئی تھی میں کہ زندگی سے بے زار' لوگوں سے بے زار ہو کر قطع تعلق کر چکی تھی۔ اس ذات پاک کی ہر نعمت سے ہر رشتہ سے ہر رنگ سے۔ ہاں وہ ٹھیک کہتا ہے۔" وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

"ٹھیک کہتا ہے وہ۔ میں ایک ظالم سفاک عورت ہوں۔ جس کے ماں باپ اس کے جیون کی خوشی دیکھنے کی چاہ میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی پرواہ کیے بغیر میں ہر وقت کمرہ بند کر کے سوگ مناتی رہی۔ کبھی زبردستی بھی چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہ لائی کہ جس کو دیکھ کر وہ ذرا سا جی اٹھتے۔ اس دنیا سے وہ تشنہ ہی چلے گئے۔ ہاں میں ظالم ہی تو ہوں۔ جو صرف اپنے لیے سوچتی رہی۔ باقی سب کو نظرانداز کر دیا پچھلے سات سالوں سے یہی میرا اصول رہا ہے۔ ہاں میں ظالم تھی۔ میں نے ایک شخص کو اس قدر اکیلا کر دیا تھا کہ وہ آدھی رات کو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر گزرتی گاڑیوں اور لوگوں کو دیکھ کر اپنا غم اپنا درد دور کر رہا تھا۔ اس کے اس اکیلے پن سے چھپتے ہوئے" آنکھیں چراتے ہوئے میں یہ شہر ہی چھوڑ گئی تھی۔ ہاں میں ظالم ہوں۔ میں سنگدل ہوں۔ مجھے جینے کا کوئی حق نہیں۔" اب وہ تیز آواز میں رونے لگی تھی۔ اس کی سسکیوں کی آواز کمرے کے اطراف میں پھیلنے لگی تھی۔ وہ تیز آواز میں روتے ہوئے بولی تھی۔

"تمہیں نہیں پتہ سکندر! آدھی رات کو تمہیں فٹ پاتھ پر بیٹھے دیکھ کر میرے دل پر کیا گزری تھی۔ کتنے دن تک میں خود سے لڑتی رہی تھی۔ تمہارے لیے ہی تو میں لڑتی رہی تھی خود سے پھر تم ٹیلی فون بوتھ میں گھسے کسی سے ٹیلی فون پر بات کرنے لگے تھے۔ میں تب تک وہاں گاڑی میں بیٹھی رہی تھی جب تک کہ تم واپس نہ ہو لیے تھے۔ گاڑی میں بیٹھی دور سے میں تمہیں دیکھتی رہی تھی سکندر میں اس رات روتی رہی تھی پوری رات۔ پوری رات مجھے قرار نہ آرہا تھا۔ تمہاری صورت بار بار میرے تصور میں چلی آتی تھی اور مجھے ڈسٹرب کرتی تھی۔ سکندر تمہیں نہیں پتہ!" وہ رندھے ہوئے لہجے میں بہت ہی دھیمے سے خود سے بولی تھی۔

"اس رات تمہارے نام کے ساتھ۔۔۔ تمہارے نام کے ساتھ میرا دل دھڑکا تھا۔ اس رات میں نے شدت سے اس حقیقت کو ماننے سے انکار کرنا چاہا تھا کہ ہاں سکندر مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ ہاں مجھے بھی تم سے محبت ہے۔"

اس کی آواز کمرے کی نیم تاریکی میں چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ پھر وہ غافل ہو گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

نانا جان اس کی بات سن کر حیران رہ گئے تھے۔

"جی نانا جان! عینی وہاں مکان کرائے پر دے دے گی۔ کیوں عینی؟"

"ہاں کیوں نہیں۔" عینی اس کا ہاتھ پکڑے اس کے قریب بیٹھ کر بولی تھی۔

"تم وہیں کیوں نہیں رہ جاتیں۔ یہاں کیا رکھا ہے؟" اب کے عینی نے اس سے سوال کیا تھا۔

"نہیں اور ویسے بھی یہاں نانا جان کو جو سکون و راحت ملتی ہے وہ انہیں کہیں نہیں ملتی۔ میرے خیال سے یہ جگہ اچھی ہے نانا جان کے لیے۔" وہ اسے نہایت محبت سے سمجھانے لگی تھی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" اس کی بات سن کر عینی بولی تھی۔

"میں نے تو خوب مزے کیے ہیں یہاں آکر تمہارا گھر بھی دیکھ لیا۔ اور ڈیٹرائٹ کے موسم کو بھی انجوائے کیا۔" وہ خوشی سے بولی تھی۔

"ادھر نواب زادہ غصے سے لال پیلے ہو رہے ہوں گے۔ کہ جا کر بیٹھ ہی گئی وہاں ماہ رانی۔ پچھلے بارہ دن سے یہاں براجمان ہوں۔" وہ شوخی سے ہنستے ہوئے بولی تھی۔

"تمہارا ٹکٹ میں بک کروا لیتی ہوں۔ ورنہ تو دل ہی دل میں وہ مجھے بھی کوس رہا ہوگا۔" جمان خوش دلی سے ہنس رہی تھی۔

عینی اس کی بچپن کی دوست تھی۔ اس کے والد نیویارک کے ایک بینک میں کام کرتے تھے۔ عینی کی چار بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ بھائی سب سے چھوٹا تھا۔ عینی کی شادی ایک پاکستانی گھرانے میں ہوئی تھی۔ لڑکا

digest library.com

ڈاکٹر تھا' جبکہ عینی خود بھی ڈاکٹر تھی۔ ان کی شادی چار سال پہلے ہوئی تھی۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ جس کی عمر ایک سال تھی۔ اس کا نام خولہ تھا۔

عینی اپنے گھر جا چکی تھی۔ نانا جان اپنی جگہ مطمئن ہو گئے تھے یا نہیں بہر حال نہ اس نے ان سے پوچھنے کی زحمت کی تھی نا ہی نانا جان نے اسے کچھ کہا تھا۔ نانا جان کی آنکھوں میں اُمڈتی حیرت کچھ دنوں تک برقرار رہی تھی۔ جسے وہ نظر انداز کر کے ختم کر چکی تھی۔ آج نماز پڑھ کر سونے کے بعد وہ دس بجے اٹھ گئی تھی۔ عینی کے جانے کے بعد آج وہ پوری طرح اچھی نیند لے سکی تھی۔ ورنہ تو ساری رات' سارا دن وہ بول بول کر اس کے کان کھائے جاتی تھی۔ اس قدر ٹف خشک پروفیشن کے باوجود وہ شوخ مزاج تھی۔ یہ اس کی ذاتی رائے تھی وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔ نانا جان غالباً اسٹڈی روم میں تھے وہ وہیں چلی آئی تھی۔

"سوری نانا جان آج مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" وہ معذرت کر رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! دراصل میں خود ابھی جاگا ہوں۔" وہ آنکھیں میچتے ہوئے ہنس کر بولے تھے۔

"ناشتا تیار کرتی ہوں میں۔"

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ریڈ کلر کا سوٹ نکالا تھا۔ "ریڈ کلر تم پر بہت اچھا لگتا ہے پہنا کرو۔" کسی نے سرگوشی کی تھی۔ تب اس نے وہ سوٹ دوبارہ الماری میں رکھ دیا تھا اور لائٹ گرین ویلوٹ کا سوٹ نکال کر پہن لیا تھا۔ حجاب لئے وہ نانا جان کے پاس آئی تھی۔

"نانا جان۔" نانا جان کی نظریں کتاب پر سے ہٹ کر اس پر جم گئی تھیں۔

"ہاں بولو کیا بات ہے؟" وہ ہچکچا رہی تھی۔ لیکن آخر بول پڑی تھی۔

"میں سکندر کے گھر جا رہی ہوں۔" اپنی آواز اسے خود اجنبی لگی تھی اور نانا جان کی آنکھوں میں ابھرتے سوال و حیرت کو نظر انداز کر کے بولی تھی۔

"میں کچھ دیر میں آجاؤں گی۔ میری غیر موجودگی میں کچھ الم غلم بنا کر نہ کھائیے گا۔" تب نانا جان معنی خیزی سے ہنستے ہوئے بولے تھے۔

"ٹھیک ہے پر جلدی آنا شاید مجھ سے بدپرہیزی کی گستاخی ہو جائے۔ پھر مجھے الزام نہ دینا۔" وہ بچوں کی طرح انگلی اٹھا کر اسے خبردار کر رہے تھے۔

اس کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دیتے وہ ہر زاویہ سے سوچ چکی تھی۔ اس کو، اپنے آپ کو۔

دروازے پر اسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ اس کی اس حرکت کے بعد تو اسے اس کی ناراضگی کا پورا یقین تھا۔

"تم.... آؤ۔" وہ اسے جگہ دیتے ہوئے بولا تھا۔

اندر لاؤنج کی حالت خاصی بگڑی ہوئی تھی۔ شاید سنڈے کا دن اس کی شامت کا دن ہوتا تھا۔

اردگرد بکھری چیزوں کو دیکھتے ہوئے وہ ان میں سے بیشتر چیزیں اٹھا کر اندر لے گیا تھا۔ پھر وہ ذرا کی ذرا وہاں رک کر کچن میں چلا گیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

"اگر تم میرے لیے کچھ بنا رہے ہو تو رہنے دو۔ مجھے کچھ نہیں کھانا پینا۔ میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آئی ہوں۔ مجھے جانا ہے دیر ہو جائے گی۔" کلائی پر بندھی گھڑی پر اک نظر ڈال کر وہ بولی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے خاموشی سے بیٹھے تھے۔ جمان نے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی شرمندگی کے آثار واضح تھے۔ شاید وہ اس دن کی حرکت پر ابھی تک پشیماں تھا۔ وہ سر جھکائے اپنی انگلی دھیرے دھیرے صوفے کے ہینڈل پر مار رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنا دایاں پاؤں بھی ہلا رہا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی تھی۔ جمان کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ آج وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ ہاں وہی روشن براؤن آنکھیں' وہی کشادہ پیشانی' چمکیلے گھنے بال' گندمی رنگت' دلکش مسکراہٹ' مضبوط جسم' لمبا اونچا قد' وہ بالکل وہی تو تھا۔

"ہاں فرق ہے تو رنگت کا۔" وہ خود سے بولی تھی۔

—— پھر جیسے وہ ہوش میں آئی تھی۔

"کیا بات کرنی ہے مجھ سے؟" اس کے چہرے سے

پریشانی و بے چینی صاف ظاہر تھی۔
"میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ باقی تم جو معاملہ طے کرنا چاہو۔ نانا جان کے ساتھ طے کرنا۔" پھر وہ اٹھ گئی تھی۔ جاتے جاتے اس نے اس کے چہرے پر خوشی کے ٹمٹماتے روشن ستاروں جیسی روشنی محسوس کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیے سے جلتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں کی یہ روشنی اس کا گھیراؤ کرنے لگی تھی۔ وہ ڈوبنے لگی تھی۔ تبھی جلدی سے وہ بولی تھی۔
"تمہیں کچھ کہنا ہے؟" اسے اپنے اس بے وقوفانہ سوال پر اچھا خاصا غصہ آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اس شخص کے سامنے خود کو کنفیوز پایا تھا گھبراہٹ کے مارے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔ جسے اس نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر وہ اس سے پہلے ہی فلیٹ سے نکل گیا تھا۔ وہ حیران ہوتی نکل آئی تھی۔ گاڑی سے ٹیک لگائے وہ اسے دور سے دیکھ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھولتی۔ وہ آگے بڑھا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے اسے بیٹھنے کو کہا تھا۔ تب وہ بیٹھ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں ایک قطرہ خون تک نہ ہو۔ یوں جیسے اس کی روح جسم سے نکال دی گئی ہو۔
وہ دروازہ بند کر چکا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کو پڑھنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جان لیتا، وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

صوفے پر لیٹے وہ ٹیلی فون پر کسی سے محو گفتگو تھا۔
"کیسی ہے؟" دوسری طرف کیے گئے سوال کو اس نے دہرایا تھا۔
"میرے جیسی۔" وہ دلکشی سے ہنستے ہوئے بولا تھا۔
"پھر تو بڑی بدصورت ہوگی۔" انجلی شگفتہ انداز میں بولی تھی۔
وہ ہنس دیا تھا۔ "ہاں میرے جیسی نہیں ہے وہ۔" اس نے سچائی سے اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔ "وہ بہت خوب صورت ہے۔" اس کا لہجہ دھیما ہو گیا تھا۔
"اچھا ذرا اس کے نین نقش بیان کرو۔ تاکہ پتہ چلے کہ کیسی ہے وہ۔" وہ پوری فرصت سے بیٹھی اس سے اگلوانے کو بے تاب تھی۔
"وہ ۔۔۔ وہ اس کے نین نقش۔" سوچ کر اس نے کہنا شروع کیا تھا۔
"اس کی ہائٹ بہت اچھی ہے مطلب لمبے قد والی، متناسب بدن، آنکھیں آں ۔۔۔ آنکھیں بڑی بڑی گول کی، اس کی اوپر کو مڑی ہوئی لمبی گھنی پلکیں، اس کی رنگت اس کی رنگت ۔۔۔ دودھیا۔ اس کے ہونٹ نازک پتلے گلاب جیسے، موتیوں جیسے دانت اس کی ستواں ناک، بال ۔۔۔ بال گھنے لمبے۔ مجھے اس کے بال بہت پسند ہیں۔" وہ مخمور لہجے میں کھل کر اس پر تبصرہ کر رہا تھا۔
وہ ابھی ابھی اٹھی تھی۔ ٹائم دیکھ کر وہ جلدی سے بیڈ روم سے نکل آئی تھی یہ دیکھنے کہ ابھی تک وہ آیا کیوں نہیں۔ لیکن لاؤنج کے صوفے پر لیٹے وہ فون پر کسی سے شاید کسی دوست سے (اس کے خیال میں) باتوں میں مصروف دکھائی دیا تھا۔ وہ خود پر اس کا تبصرہ سن چکی تھی۔ پھر کچھ خفگی سے اس کے پاس آکر ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر کریڈل پر رکھ چکی تھی۔
"کسے معلومات پہنچا رہے تھے آپ؟" اس کے تفتیشی انداز پر وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ اس کے اس طرح دیکھنے سے نروس ہو گئی تھی۔ تبھی جلدی سے پلٹ کر چلی گئی تھی۔ اسے اس کا خود پر اس طرح تبصرہ کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اس سے اس حرکت کی امید نہیں کر رہی تھی۔ عصر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ چائے بنانے کچن میں چلی گئی تھی۔ وہ وہیں ابھی تک لیٹا ہوا تھا۔ اپنا بازو اس نے اپنی آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ اس لیے چائے بنا کر جب وہ اسے کپ دینے آئی تھی۔ تو سمجھ نہ سکی تھی کہ وہ سویا ہوا ہے یا جاگ رہا ہے۔ چند لمحے وہ کشمکش و پیچ میں کھڑی رہی تھی۔

”چائے لیں آپ۔“ وہ بے خبر سو رہا تھا۔

اس کا بازو ہلاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ”کمرے میں جا کر سو جائیں۔ یہاں آپ کو ٹھیک طرح سے نیند نہیں آئے گی۔“ غنودگی میں وہ مندی مندی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”سونے دو مجھے۔“ پھر اس نے اسے سونے دیا تھا۔

ان کے نکاح کو ایک مہینہ ہونے لگا تھا۔ نکاح میں عبداللہ، ڈاکٹر واحد اور چند دوسرے دوستوں نے شرکت کی تھی۔ نکاح بہت سادگی سے ہوا تھا۔ جس دن نکاح ہوا۔ جس دن جمان کا نام اس کے نام کے ساتھ لگا تھا۔ اس دن وہ اپنے اوپر بیتی تمام مشکلات و تکالیف کو ہمیشہ کے لیے فراموش کر چکا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے خوشی سے اس کا دل دھڑکنا بند کر دے گا۔ کتنا بہترین دن تھا وہ اس کے لیے۔ اس کو اپنی منزل، اپنی خوشی مل گئی تھی۔ ”ہاں وہی ہے جو خلوص سے مانگی گئی دعا کو قبول کرنے والا ہے۔“ اس دن اس کا دل بار بار اسی بات کی تکرار کیے جا رہا تھا۔

گاڑی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اس کی توجہ باہر کے مناظر پر تھی۔ وہ شہر کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اس وقت وہ ایک ویران علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ کافی سفر وہ طے کر چکے تھے دور دور تک صرف برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ اس دن مطلع صاف تھا۔ سورج نکل چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت سے برف تیزی سے پگھلنے لگی تھی۔ اسے بہت دور ایک بہت بڑا فارم ہاوس نظر آیا تھا۔

”یہاں رکو گی؟“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ بیٹھا تھا۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا تھا۔ گاڑی فارم ہاوس کے نزدیک پہنچ کر رک گئی تھی۔ وہ دونوں

گاڑی سے اتر گئے تھے۔

”آؤ۔“ اس نے اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلنے لگی تھی۔ وہ فارم کے لکڑی کی دیوار کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہاں موجود آدمی انہیں دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا تھا۔ جواب میں سکندر بھی مسکرا دیا تھا۔ وہاں مختلف نسل کے گھوڑے موجود تھے۔ آج بہت دنوں کی بارش کے بعد سورج نے دیدار کرایا تھا۔ اس لیے اس چلچلاتی دھوپ سے گھوڑے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور اس خوشی کا اظہار ان کے دوڑنے بھاگنے پھرنے سے ہو رہا تھا۔ وہاں انہیں کچھ تعداد میں کتے بھی نظر آئے تھے جو مختلف نسل کے تھے۔ ان کی تعداد کم تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان گھوڑوں کی حفاظت کے لیے رکھے گئے تھے۔ آدمی چارہ بنانے میں مصروف تھا۔ کتوں نے انہیں دیکھ کر پہلے پہل تو عجیب و غریب منہ بنائے تھے۔ پھر انہوں نے فل والیم میں بھونکنا شروع کیا تھا۔ لیکن مالک کی بروقت ڈانٹ پر چپ ہو گئے تھے۔ حد نگاہ تک برف تھی۔ پورا علاقہ سفید چادر سے ڈھکا دکھائی دے رہا تھا۔

”چلیں۔“ سکندر کو اس نے مخاطب کیا تھا۔ گاڑی فارم ہاوس کو پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ راستے میں کہیں کہیں گھر بھی دکھائی دیے تھے۔ اتنے ویرانے میں موجود ان گھروں سے اسے خوف محسوس ہوا تھا۔

گاڑی سڑک کے کنارے رک گئی تھی۔ وہاں ذرا فاصلے پر ایک پہاڑی چوٹی تھی۔ جو درختوں اور برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ اسے گاڑی سے اترنے کا کہہ کر خود بھی اتر گیا تھا۔ وہ اسے ساتھ لیے پہاڑی کی طرف بڑھا تھا۔ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے اسے کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن اب جب وہ لے کر آیا ہی تھا تو اسے یہ دشواری برداشت کرنی ہی تھی۔ پہاڑی پر موجود درخت بہت ویران و اداس لگ رہے تھے۔ ان پر موجود برف اسے مزید سرد و خشک بنائے ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ اکیلے اداس درخت کسی کو آتا دیکھ کر خوشی سے جھومنے لگے ہوں۔ درختوں پر موجود برف دھوپ کی تمازت سے پگھل کر ”بھر بھر“ کی آواز سے گرنے لگی تھی۔ جس سے درختوں کی حالت مزید وحشت ناک لگنے لگی تھی۔ احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے وہ اوپر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جبکہ سکندر چوٹی تک پہنچ گیا تھا۔ وہ رک کر پیچھے

مڑ کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ اس تک بڑی مشکلوں سے پہنچ گئی تھی۔ وہ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ چھوٹا سا درخت جس کی ٹہنیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ وہ بھی اس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اس کے پاس کھڑے ہو کر اپنی اکھڑی سانسیں بحال کر کے وہ نیچے علاقے کی خوب صورتی میں کھو گئی تھی۔ سکندر نے اچھل کر درخت کی ٹہنی پکڑ کر اسے بہت زور سے ہلایا تھا۔ اس کے ہلانے پر پورا درخت ہلنے لگا تھا۔ درخت پر موجود برف جمان کے اوپر پھوار کی طرح گرنے لگی تھی۔ وہ اچھل گئی تھی' اس اچانک کارروائی سے۔ سکندر نے ٹہنی کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کی طرف مسکرا کر دیکھنے کے بعد وہ اس کے پاس سے گزرتے' اس کے کندھے کو اپنے کندھے سے ہلکا سا مارتے ہوئے' دوسرے درخت کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ وہاں خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔ وہاں کتنی دیر تک بیٹھی رہی تھی وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ اپنی انگلی سے برف پر کچھ لکھ رہی تھی۔ سکندر اس کے پیچھے کھڑا اس کے لکھتے ہاتھ کو چند لمحے دیکھتا رہا تھا۔ پھر اس سے بولا تھا۔

"چلنا نہیں؟" وہ یکدم اٹھ گئی تھی۔ پھر وہ اس سے آگے اور وہ اس کے پیچھے پیچھے پہاڑی سے اترتے ہوئے گاڑی تک پہنچے تھے۔ باقی راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔

digest library.com

۱۱ اکتوبر ۲۰۰۳ء

میرے ماں باپ نے محبت کی شادی کی تھی۔ میری والدہ عیسائی اور والد ہندو تھے۔ ان کا یہ مذہبی فرق اس لیے تھا کہ انہیں میرے بچپن میں اس مذہبی اختلاف کے ہاتھوں مرنا تھا اور مجھے یتیم ہونا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں یتیم نہ ہوتا۔ اگر میں یتیم نہ ہوتا تو میں اظہر انکل کے گھر نہ جاتا۔ اظہر انکل کی موت فرقہ پرستی کے ہاتھوں نہ ہوتی تو میں ان کے گھر پر پڑا رہتا۔ ان کی بیوی میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔ وہ خود بے سہارا ہو گئی تھیں۔ انہیں اپنے اور اپنے بچوں کے لیے سہارے کی ضرورت تھی' ایسے میں وہ کمزور عورت بھلا میرے لیے کیا کر سکتی تھی اور پھر شاید ان کے بھائیوں نے اسے میرے متعلق کچھ بھی کہہ کر مطمئن کر دیا تھا۔ بہرحال اگر ان کے بھائی مجھے اس گاڑی ٹھیک کرنے والے کے حوالے نہ کرتے تو میں منوج بھائی سے نہ مل پاتا۔ منوج بھائی کو مجھ سے شدید محبت نہ ہوتی تو وہ مجھے موہن راج کے خوف سے باہر نہ بھیجتا۔ امریکہ اگر میں مسلمان نہ ہوتا اور اگر مسلمان نہ ہوتا تو جمان میری زندگی میں نہ آتی۔ میری قسمت میں مسلمان ہونا تھا' اس لیے میری زندگی قدم قدم پر مجھے منزل کے قریب لاتی جا رہی تھی۔

منوج بھائی ایک شدت پسند انسان تھے۔ محبت میں بھی شدید' نفرت میں بھی شدید۔ اسے بھی مجھ سے محبت تھی کیونکہ اس نے مجھے ایک بیٹے' بھائی کی طرح پالا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے اسے اپنے مسلمان ہونے کا بتایا تھا تو وہ بگڑ گیا تھا مجھ پر۔ مجھے گالیاں دیں' کوسا' اپنا ہر تعلق ختم کر دیا۔ میرا مقصد اسے تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ جب میں نے اسے کہا تھا کہ اس نے مسلمانوں کے ساتھ بہت برا کیا تھا۔ میرا مقصد اسے آئندہ اس طرح کی حرکت سے روکنا تھا کہ پھر کبھی اگر وہ اس قسم کی کوئی حرکت کرنے کا سوچے تو اس کا ضمیر اسے کبھی تو ملامت کرے' روکے' منع کرے۔ اس لیے میں نے کھل کر اس کے غلط فعل کی مخالفت کی تھی۔ وہ غلطی جو میں نے اس وقت کی تھی' اب اس کا ازالہ مجھ پر فرض ہو گیا تھا۔ میری اس وقت کی بے چینی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری ماں عیسائی تھی۔ اسے اس وجہ سے قتل کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک ہندو سے شادی کر چکی تھی۔ اس مذہبی فرق سے پیدا شدہ تباہی نے مجھے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس لیے اس وقت اس مذہبی منافرت سے مجھے نفرت ہونے لگی تھی۔ اس وقت جو شخص اس قسم کی منافرت' فرقہ پرستی' تعصب کا ثبوت دیتا' وہ مجھے زہر لگنے لگتا۔ اس مذہبی فرقہ پرستی نے مجھ سے میرے والدین چھینے تھے۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی اس بے

چینی کی۔

اسی طرح ہونا تھا۔ میں خوش نصیب ہوں کہ اس پروردگار نے مجھے اندھیروں سے نکال کر روشنیوں میں لا کھڑا کیا۔ اے اللہ۔۔۔ میں تیری جتنی بھی تعریف کروں' جتنا بھی تیرا شکر ادا کروں' کم ہے۔" ڈائری اس نے بند کر دی تھی۔

* * *

"سوئیٹر نکال کے دو مجھے۔" بیڈ پر بیٹھا وہ اپنے جوگرز پہن رہا تھا۔ وہ کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ اس کی آواز پر وہ الماری سے اس کا سوئیٹر نکال کر اس کے پاس لے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے سوئیٹر لیتے ہوئے اس نے اس پر ایک گہری نگاہ ڈالی تھی پھر وہ سوئیٹر پہننے لگا تھا۔ جلدی سے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا برش اٹھا کر بالوں میں چلانے لگا تھا۔ پرفیوم کی تقریباً آدھی شیشی تو وہ اپنے کپڑوں پر انڈیل چکا تھا۔ پرفیوم کی نہایت مسحور کن خوشبو پورے کمرے میں پھیلنے لگی تھی۔ وہ اس کی اس قدر تیاری پر خفا ہو گئی تھی۔ (اوروں کا خیال نہیں۔)

"ایک کپ چائے تو دو۔" کلائی پر رسٹ واچ باندھتے ہوئے وہ مصروف انداز میں بولا تھا۔ وہ بے دلی سے چلی گئی تھی۔ چائے لا کر اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ عجلت بھرے انداز میں چائے کے کپ کو اٹھاتے ہوئے وہ اس سے سپ لینے لگا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی جیب پر ہاتھ مار کر اس نے پرس کی موجودگی کی تسلی بھی کر لی تھی۔ چائے ختم کر کے وہ کپ رکھ چکا تھا۔ گاڑی کی چابی سائیڈ ٹیبل کے دراز میں دیکھی لیکن وہاں موجود نہ تھی۔

"چابی کہاں ہے گاڑی کی؟" وہ اس سے پوچھنے لگا تھا۔

"آپ ہی نے رکھی تھی۔" وہ بیڈ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے بولی تھی پھر سکندر نے کچھ سوچ کر تکیہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ چابی وہیں پڑی تھی۔ چابی اٹھا کر وہ دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے دراز میں سے اپنے سن گلاسز نکال کر اپنی آنکھوں پر لگا لیے تھے۔ اب آئینے کے سامنے کھڑا اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ شیشے میں سے جھانکتے اس کے وجود پر اس کی نظر پڑ چکی تھی۔ شاید جمان کو بھی اپنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ تبھی جلدی سے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اس کے قریب آ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ یکبارگی اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

"اب مجھے دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ اب تم مجھے دیکھ سکتی ہو۔ شرعاً" و قانوناً"۔ سمجھیں نا تم۔" پھر یکدم "دیر ہو رہی ہے" کہتا ہوا چلا گیا تھا۔

اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ اس کی چوری پکڑ چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ بے دلی سے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی جب نانا جان کا فون آیا تھا' اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔ وہ تب شرمندہ ہو گئی تھی۔ اس نے انہیں ان کے ہاں آنے کا بتا کر فون بند کر دیا تھا۔ بے دلی سے کپڑے چینج کر کے وہ تیار ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک اسی کو سوچ رہی تھی۔ اسے سکندر سے محبت تو اسی دن ہو گئی تھی جب اس نے اسے فٹ پاتھ پر اکیلے بیٹھے دیکھا تھا لیکن اس سے شادی کا فیصلہ اس نے اس لمحے کیا تھا جب وہ اس سے اپنے ساتھ کی گئی زیادتی کا حساب مانگ رہا تھا۔ اس کے رونے' اس کے کرب نے اسے اس وقت فیصلہ کرا لیا تھا۔ وہ اس کی دیوانگی' اس کی استقامت کو دیکھ کر ہار گئی تھی اسی لمحہ' اسی پل۔

کچن میں کھانا بنانے کے ساتھ وہ اس کی اور اپنی ایک ایک ملاقات کو یاد کر رہی تھی۔ کچن سے فارغ ہونے کے بعد اس نے عینی کو فون کیا۔ ڈھیر ساری باتوں میں وقت کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ عینی جب ایک بار بولنے پر آتی تو چپ ہونے کا نام نہ لیتی تھی' وہ چلا آیا تھا۔ اسے فون پر مصروف دیکھ کر وہ کچن میں چلا گیا تھا۔ اس کی نظریں اس کے تعاقب میں کچن تک گئی تھیں۔ وہ فریج سے سیب نکال کر کھانے لگا تھا پھر پانی کی ایک بوتل اور گلاس لیے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔

digest library.com

عینی کیا کہہ رہی تھی' اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ اس کا سارا دھیان اس کی طرف لگا ہوا تھا پھر کام کا بہانہ بنا کر اس نے فون بند کردیا تھا۔ اسے عجیب سی الجھن ہو رہی تھی' وہ اس کی اسی بے نیازی پر کڑھ رہی تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا' اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔

"نہیں کیوں اس کی پروا کرنے لگی' جب اسے ہی میری پروا نہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ وہ وہیں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیا مصیبت ہے۔ لگتا ہے یہ عینی صاحبہ فون پر سارا دن اسے باتوں میں لگائے رکھے گی۔" وہ اس قدر طویل انتظار سے اکتا گیا تھا۔ فون پر باتوں کے دوران ان کے منہ سے وہ اس کا نام سن چکا تھا۔

بیڈ پر پڑے میگزین کے صفحات الٹتے پلٹتے اس نے قدرے بے زاری سے میگزین بیڈ پر پھینک دیا تھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔ جب اس نے اسے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے دیکھا تھا' وہ سلگ ہی تو گیا تھا اس کے اس انداز پر۔ تبھی جا کر اس نے تیز آواز میں کہا تھا۔

"فرصت مل گئی آپ کو۔" شاید مقصد اندر کا سارا غبار نکالنا تھا۔ وہ اس کے آنے کے انتظار میں پاگل ہو گیا تھا جبکہ وہ یہاں۔ اس آواز پر جیسے وہ اچھل گئی تھی۔

"جی ہاں۔"

"بہت شکریہ۔" طنز سے بھرپور لہجے میں کہا گیا تھا پھر سکندر کی نظریں اس کے سراپے میں الجھ گئی تھیں۔

لائٹ بلو جینز کے سوٹ پر گرم شال پہنے' میک اپ کے نام پر صرف ریڈ لپ اسٹک لگائے وہ اسے دنیا کی حسین ترین عورت دکھائی دی تھی۔ اس کے سراپے میں جو نمایاں خوبی اسے ممتاز کرتی تھی' وہ اس کا اونچا لمبا قد تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا تھا۔ ایک حسین پاک بیوی کا تصور ہر مرد کی اولین خواہش ہوا کرتی ہے اور اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔

"کچھ کھلاؤ مجھے۔" کہہ کر وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں لیٹ گیا تھا۔ اسے اس کج روی کی امید نہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں کیوں نمی آئی تھی۔ کیا اسے اس کا اگنور کرنا بری طرح کھل رہا تھا۔ وہ اب اطمینان سے کسی دوست سے فون پر بات کرنے لگا تھا۔

"اسے تو یہ احساس تک نہیں کہ بیوی کو جھوٹے منہ ہی مبارک باد دے دے برتھ ڈے کی لیکن مجھے کیا۔" باؤل ٹیبل پر پٹختے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

"ہاں سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اب جب مل گئی ہوں تو میری کوئی قدر ہی نہیں۔ ڈال کے رکھ دیا ہے ایک کونے میں۔" اس کی آنکھیں اب اشک بہانے کو بے تاب تھیں پھر کوئی آواز اس کے اندر گونجی تھی۔

"تم ایک ناشکری عورت ہو۔" یکلخت آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے اپنے رب سے معافی مانگی تھی۔

باؤل اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا جبکہ ایک ناگواری کی لہر اس کے تن بدن میں بھڑک اٹھی تھی۔ (کسی کے دل میں آگ لگا کر ہنس رہا ہے۔) وہ تلخی سے خود سے بولی تھی پھر بات کرنے کی پہل اس نے خود ہی کی تھی۔

"مجھے نانا جان کے پاس جانا ہے' ان سے ملنے۔"

اس کے چہرے پر خفگی کی گہری لکیر اسے نظر آگئی تھی پھر اس کو انجوائے کرتے ہوئے وہ بہت دلکشی سے ہنس دیا تھا بہت تیز آواز میں۔ وہ اپنی بات کے جواب میں اس بے ہودہ ہنسی کو سمجھ نہ پائی تھی' تب ہی سلگ کر بولی تھی۔

"کیا جوک سنایا ہے میں نے۔" پھر مزید بغیر کچھ کہے وہ اٹھ کر جانے لگی تھی۔ اس نے ہنسی کو بریک لگا کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھا دیا تھا۔

"غصہ آرہا ہے نا مجھ پر۔" وہ اب بھی زیر لب ہنس رہا تھا۔ اسے اس کی ہنسی زہر لگ رہی تھی۔

"کہو نا کہ تمہیں غصہ آرہا ہے مجھ پر۔ بلیو می' میں

کچھ نہیں کہوں گی۔" وہ اسے چھیڑنے کو بولا تھا۔

"نانا جان کے ہاں چلنا ہے یا نہیں۔" حتمی انداز میں وہ اسے دیکھ کر بولی تھی۔

"نہیں نے انکار کیا۔" وہ تابعدارانہ انداز سے دل پر ہاتھ رکھ کر بولا تھا۔

"میں حجاب لیتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی تھی۔

"بیٹھو، پہلے مجھ سے تو مل لو پھر اپنے نانا جان کے پاس جانا۔" اس نے اسے دوبارہ بٹھا دیا تھا۔

"یہ خوامخواہ ہنس کیوں رہے ہیں آپ۔" اس کی ہنسی اسے مزید تپا رہی تھی۔

"اوکے، نہیں ہنستا۔ آج کے بعد میری ہنسی پر بھی پابندی اور کچھ۔"

وہ چپ رہی تھی۔ پھر نجانے اسے کیا ہوا تھا کہ اگلے پل اس نے اپنا ہاتھ اس کی شرٹ کی جیب کی طرف بڑھایا تھا۔

"میرا گفٹ دیں۔" کہتے ہی اس کی جیب سے اس نے پرس نکال لیا تھا۔ وہ اس انداز پر تو نثار ہی ہو گیا تھا۔

"جی نہیں، میں خودغرض لوگوں کو گفٹ نہیں دیا کرتا۔"

اس لمحے وہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ اب اس کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ بے خود ہو کر اس میں کسی اور کے عکس کو دیکھنے لگی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔" اس نے بالوں سے نکلتی اس کی لٹ کو چھوتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں، کچھ نہیں۔" اس کی آواز سے وہ ہوش میں آئی تھی۔

پھر اس کا ہاتھ اپنے پرس کی طرف بڑھا تھا۔

"یہ لو تمہارا گفٹ۔" پھر وہ اس کے ہاتھ سے وہ لے کر اٹھ گئی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو تم۔"

"آپ بیٹھیں میں آ رہی ہوں۔"

پھر وہ ایک بیگ سمیت کمرے سے نکلی تھی۔ وہ لمحہ لمحہ اس کے قریب آ رہی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر نیچے کارپٹ پر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔

ماضی، حال، مستقبل، محبت، شادی اور قسمت

آپ کا برج کیا کہتا ہے؟

آپ کے ستارے

○ آپ اپنی شخصیت کا جائزہ لیں اور اپنے دوستوں کو پہچانیں۔ اپنے منفی پہلو پر غور کریں اور خوبیوں کو ابھاریں

یہ کتاب آپ کی بہترین دوست اور تنہائی کی ساتھی ثابت ہوگی۔

○ پہلی بار 12 برجوں پر ایک مستند کتاب آج ہی قریبی بک اسٹال دبکڈپو سے طلب فرمائیں۔

○ 400 صفحات آفسٹ پرنٹنگ، مجلد خوبصورت سرورق

قیمت صرف 150

(ڈاک خرچ پیکنگ فری)

○ آج ہی 150 روپے کا ڈرافٹ پے آرڈر منی آرڈر ارسال فرمائیں۔

ڈاک سے منگوانے اور دستی خریداری کے لیے تشریف لائیں۔

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37۔ اردو بازار کراچی

فون:۔ 216361

"اچھا کیا جو تم یہ لے آئیں۔ نانا جان کے لیے میں کچھ لانا بالکل بھول گیا تھا۔" وہ اس کے بیٹھنے پر کچھ حیرت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"یہ آپ کے لیے ہے' میری طرف سے۔ دراصل.... مجھے یہی تحفہ بہتر لگا آپ کو دینے کے لیے تو...." اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"میرے لیے۔" وہ خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات چہرے پر سجائے پوچھ بیٹھا تھا۔

"ہاں۔" اس کی آواز بہت نرم اور آہستہ محسوس ہوئی تھی۔ وہ کیک کو دل سے لگا کر بولا تھا۔

"تمہیں حاصل کر کے ایک بازی میں جیت چکا ہوں اور آج اس قدر حسین تحفہ لے کر یہ بازی تم مجھ سے جیت گئیں۔ تمہاری اس جیت کو میں شاندار طریقے سے سیلیبریٹ کرتا ہوں۔"

digest library.com

* * *

وہ دونوں نانا جان سے ملنے آئے تھے۔ ان دونوں کو آپس میں بولتا چھوڑ کر وہ چائے بنانے کچن میں چل دی تھی۔ چائے کے کپ ان کو تھما کر وہ خود بھی کپ ہاتھ میں لیے وہاں بیٹھ گئی تھی۔ نانا جان سکندر سے کہنے لگے تھے۔

"بیٹا! میں بہت عرصے سے تم سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ...." چند لمحے بعد وہ پھر سے بولے تھے۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اور جمان یہاں آ کر رہو۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلا کیا کروں گا۔ سوائے بوریت کے یہاں کچھ نہیں۔ تمہارے کام پر جانے کے بعد جمان بھی اکیلی گھر پر رہ جاتی ہے۔ اگر یہ یہاں رہے گی تو اس کی بھی تنہائی دور ہوگی اور میری بھی۔ بیٹا! یہ باقی ماندہ زندگی میں تم لوگوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ یوں الگ تھلگ رہ کر نہیں۔ میں تم دونوں کی خوشیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم دونوں کے وجود سے اس گھر میں رونق دیکھنے کا متمنی ہوں۔ بہت اکیلا ہو گیا ہوں میں۔ میں تمہارا باپ ہوں اور تم میرے بیٹے۔ یہ سب جمان اور تمہارا ہی تو ہے۔ بیٹا! کچھ مت سوچنا' بس صرف میرا سوچنا۔" ان کی آنکھوں میں ایک نمی بھری خاموش التجا تھی۔ وہ خاموش رہا تھا۔ جمان اٹھ کر چلی گئی تھی۔

پھر نانا جان کے کسی دوست کا فون آیا تھا۔ وہ ان سے بات کرنے لگے تھے۔ وہ وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ جمان کو ڈھونڈتا ہوا نانا جان کے بیڈ روم میں چلا آیا تھا۔ وہ وہاں بیڈ روم کی صفائی کر رہی تھی۔ ویکیوم کلینر سے کارپٹ صاف کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اسے اندر آتا دیکھ چکی تھی لیکن بدستور کام میں لگی رہی تھی۔

"تم یہاں رہنا چاہتی ہو یا وہاں؟" وہ براہ راست پوچھنے لگا تھا۔ اس کا سوال اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

"تم سے پوچھ رہا ہوں میں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

"جہاں آپ چاہیں۔" وہ اسے پر سوچ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے جانے کا کہہ کر کمرے سے نکل گیا تھا پھر وہ دونوں گھر لوٹ آئے تھے۔

* * *

اس کا کارڈ ملتے ہی وہ خوشی سے رونے لگی ہے۔ اس کے پاس بیٹھا روحیل اس کے ہاتھ سے کارڈ لیتے ہوئے پڑھنے لگا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔ "جب فرینڈز یاد کرتے ہیں' جب وہ ہماری خوشیوں کو اپنی خوشی سمجھتے ہوئے ہمیں اہمیت کا احساس دلاتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس وقت تمہارے چہرے پر اس جھلملاتی خوشی کا عکس یہ بتا رہا ہے کہ سکندر نے تمہاری برتھ ڈے پر کارڈ بھیج کر تمہارا مان بڑھا دیا ہے۔ وہ تمہیں یاد رکھے ہوئے ہے۔" کارڈ بند کرتے ہوئے روحیل اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولتی ہے۔ اینل شراب اس کا شوہر ہے۔

"یاد تو میں بھی اسے کرتی ہوں' رمیش بھی' ہم سب دوست۔ روحیل! اس کی یاد ہمارے دلوں میں ایک روشن قندیل کی طرح ٹمٹماتی ہے۔ روحیل! سب کچھ ختم ہو سکتا ہے' پر دلوں میں روشن جلتی یاد نہیں۔

یاد بھی نہیں۔" وجنتی کے سرگوشی نما اس جملے پر روحیل نے اثبات میں سر ہلا دیا ہے۔

❁ ❁ ❁

"آج تم کیوں یاد آتے ہو۔ اب جبکہ میں تمہیں بھولنا چاہتا ہوں لیکن تم... ہاں میں محبت کرتا ہوں تم سے' بہت شدید۔ میں نے تمہیں اپنا بیٹا سمجھا تھا لیکن تم نے.... تم کہتے ہو کہ میں نے ظلم کیا تھا' خون بہایا تھا' بہت غلط کیا تھا میں نے لیکن میں نے یہ سب اپنے دھرم کے لیے ہی کیا تھا۔ تم ایک مفاد پرست انسان ہو۔ میں نے تمہارے لیے کیا کیا اور تم نکلے وہی گندی نالی کے کیڑے۔ تم ایک خود غرض انسان ہو۔ اپنا گندا خون ظاہر کر دیا نا تم نے۔ ہاں میں نے چلا چلا کر کہا تھا۔ جب تم نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ مسلمان ہو چکے ہو۔ تم مسلمان ہو گئے تھے' یہ بات میرے دل و دماغ کو تپا گئی تھی۔ اس وقت برا بھلا کہہ کر میں نے تم سے اپنا ہر تعلق توڑ دیا تھا لیکن مجھے وہ راحت کیوں نہیں مل رہی۔ کیوں میرا دل تمہاری طرف کھنچا چلا جاتا ہے' آج میں کیوں بے سکون رہنے لگا ہوں۔ یہ حقیقت بتا کر کہ میں نے بہت ظلم کیا ہے۔ تم نے مجھے بے سکون کر دیا ہے۔ آج چلے جاؤ اپنی یاد سمیت' چلے جاؤ تم اس دل سے۔ اپنی یادوں سے کہو کہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔" وہ نم آنکھوں سے تخیل میں اس کی صورت سے ہم کلام تھا۔

❁ ❁ ❁

۲۵ نومبر ۲۰۰۳ء

نانا جان کی بیوی ان کی کزن (چچا کی بیٹی) تھیں۔ ان کی وفات کو بارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان کی وفات کے بعد وہ اکیلے رہ گئے تھے لیکن چند سال بعد جمان کے بیوہ ہونے اور یتیم ہو کر نانا جان کے پاس چلے آنے سے وہ اکیلے نہیں رہے تھے لیکن جمان کی رخصتی کے بعد وہ پھر سے تنہائی کا شکار ہو گئے تھے۔ آج صبح انہوں نے مجھ سے بات کی کہ ہم ان کے پاس ان کے گھر میں رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ تنہا اب نہیں رہ سکتے لیکن اس کے پس پردہ دوسری وجہ بھی ہے۔ بزرگ بہت دور اندیش ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کا بھلا چاہتے ہیں۔ اولاد پر کچھ بھی ظاہر کیے بغیر وہ ان کے لیے جتنا ممکن ہو سکے کر گزرتے ہیں۔

انہیں ہم سب سے محبت ہے' میں یہ جانتا ہوں لیکن انہیں ہمارے مستقبل کی فکر بھی ہے' یہ بھی میں جانتا ہوں۔ وہ اپنی زندگی ہی میں ہمارے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہیں تاکہ بعد میں ہمارے لیے کوئی پرابلم نہ ہو۔ محبت سے زیادہ' محبت کی آڑ میں وہ ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں بزرگ بڑے ہی محبت کرنے والے اور اچھا سوچنے والے ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ اولاد کبھی اپنے فائدے اور نقصان کو نہیں بھولتی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ.... لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر میں صرف ان نمی بھری آنکھوں کے آگے ہار گیا ہوں جس میں مجھ سے التجا کی گئی تھی کہ میں صرف ان کے لیے سوچوں۔ میں صرف جمان اور

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے معروف ناول

* دل پھولوں کی بستی — [illegible] — 400/-
* [illegible] — [illegible] — 150/-
* وہ خبطی سی دیوانی سی — [illegible] — 400/-
* [illegible] — [illegible] — 550/-
* [illegible] — [illegible] — 180/-

اور

* خواتین کا گھریلو انسائیکلوپیڈیا — 600/-

خوبصورت سرورق • آفسٹ پیپر • خوبصورت چھپائی • دیدہ زیب مضبوط جلد

شائع ہو گئے ہیں

سول ایجنٹ مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37۔ اردو بازار کراچی

لاہور میں:
• لاہور اکیڈمی • سلطان نیوز ایجنسی
• عظیم اینڈ سنز • اسلامیہ کتب خانہ

راولپنڈی میں: اشرف بک ایجنسی

حیدرآباد میں: مہران نیوز ایجنسی

ناناجان کے لیے سوچوں گا۔ میں ان کی خوشی کے لیے ایسا کروں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ جن لوگوں سے میں اپنی زندگی اپنی جان سے زیادہ محبت کرتا ہوں' انہیں ادھوری خوشیاں دوں۔ میں خودغرض بن کر جمان کو صرف اپنی محبت میں مقید نہیں کر سکتا۔ اس کی محبت پر ناناجان کا بھی حق ہے' مجھ سے زیادہ۔ میں اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بناؤں گا۔ انا سے زیادہ ضروری چیز محبت ہے۔ ان کے لیے رشتوں کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ میں اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں لادنا چاہتا۔ چند سال کی باقی ماندہ زندگی میری ہو یا ناناجان کی یا جمان کی' کسی کی بھی۔ کیونکہ موت کا کوئی بھروسہ نہیں' ان چھوٹی اناؤں کے مسئلے پر قربان نہیں کروں گا۔ انشاء اللہ میں کل ہی جمان کو پیکنگ کا کہہ دوں گا۔ ٹھیک دو دن بعد کا دن ہمارا ناناجان کے ساتھ ہوگا۔

آج ۲۵ نومبر کو جمان کی برتھ ڈے ہے۔ آج کا دن میرے لیے اس حوالے سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ آج میری شادی کے بعد پہلی خوشی ہے۔ دوسرا آج میری جان سے پیاری بیوی نے مجھے ایک خوبصورت تحفہ دے کر میرے جیون کے ________ لمحوں کو چار چاند لگا دیے۔ محبت کا اظہار ضروری ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے لیکن اس محبت کا عملی اظہار پھولوں سے کر کے اس نے میرا دل خوشی سے مالا مال کر دیا ہے۔

ایک منٹ' آپ حیران ہوں گے کہ میں یہ دعوی کس برتے پر کر رہا ہوں کہ میری بیوی مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے تو اس کی بھی ایک داستان ہے۔

پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے میری نظریں اس کے لکھتے ہاتھ پر جم گئی تھیں۔ اس پل خوشی سے میں مرنے لگا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ میں تیز بہت تیز چیخ چیخ کر سب کو بتاؤں کہ وہاں برف پر کئی جگہ اس نے میرا نام لکھا تھا' صرف میرا نام۔ وہ کھوئی ہوئی تھی۔ اسے پتا بھی نہیں تھا کہ میں اس کے پیچھے کھڑا ہوں پھر جب میں نے اسے جانے کا کہا تھا تو وہ یکدم گھبرا کر کھڑی ہوئی تھی۔ شاید اسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ میرا نام اس علاقے کی اس خوبصورت چھوٹی سی پہاڑی چوٹی پر لکھ گئی ہے۔

اس پل میں' میں یہ جان گیا تھا کہ جمان سکندر بھی اپنی محبت میں شدید ہے۔ ایک محبت اسے اس مرد سے بھی جسے موت کے اتنے عرصے بعد بھی وہ نہیں بھولی تھی ایک محبت میں۔ اب مجھے اس شدت پسند بیوی کے لیے اسفندیار بننا ہی ہوگا' اس کا اپنا اسفندیار۔

digest library.com

❁❁❁

آسمان پر کہیں کہیں بجلی چمک رہی ہے۔ ساتھ ہی بادل گرجنے کی آواز جان نکال کر رکھ دیتی ہے۔ بارش آج شام سے ہی جاری ہے۔ پانی کے قطرے کھڑکی کے شیشے پر جمع ہو رہے ہیں۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر اپنی نظریں باہر جمائے ہوئے ہے۔ کچھ لوگ ہاتھوں میں چھتریاں لیے تیز تیز قدم اٹھاتے نظر آ رہے ہیں جبکہ ٹریفک برائے نام ہی ہے۔ اس قدر طوفانی بارش میں سب لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ اس وقت رات کے نو بج رہے ہیں لیکن اتنی خاموشی ہے' لگتا ہے کہ آدھی رات کا وقت ہو۔ ڈیسٹرائٹ میں اس وقت بھی خاصی گہما گہمی نظر آتی ہے لیکن آج وہ اب سڑک پر سے نظریں ہٹائے اسے دیکھنے لگی ہے۔ بیڈ پر بیٹھا' کمبل میں چھپا وہ ڈائری ہاتھ میں لیے کچھ لکھ رہا ہے۔ ابھی عبداللہ کو فون کر کے اس نے آنے سے معذرت کی ہے۔ عبداللہ کے گھر آج ان کا ڈنر تھا لیکن بارش نے اس ڈنر کا مزہ خراب کر دیا۔ اس کی نظروں کو خود پر محسوس کر کے اس نے بھی ڈائری پر سے اپنی نظریں ہٹائی ہیں۔ اب ہاتھ ہلا کر ہنس پڑا ہے۔ وہ اس کی ہنسی میں کھو سی گئی ہے۔

محبتوں میں اتنا اعجاز ہے کہ وہ انسان کو مسحور کر دیتی ہیں اور وہ بھی اس شخص کی محبت میں ہار گئی تھی اپنا آپ۔۔۔۔

❁ ❁